بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروفیسر ظفر احمد

فکر ونظر کی مستحکم بنیادیں

بحوالہ کتاب اللہ واصحاب رسول اللہ ﷺ

﴿آخری قسط﴾

(۷) ترجیحات وتوضیحات :

مقالۂ ہذا کے بعض مضامین خصوصاً اس کے ابتدائی حصے اس لحاظ سے زیادہ اہم ہیں کہ ان میں دفاعی کی نسبت اقدامی استدلال زیادہ نمایاں ہے، ان مضامین میں مذکور بعض قرآنی آیات اور ان کے متعلقات پر زیر نظر مضمون میں مزید روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ حتی الامکان ہر طرح کے شبہات اور وساوس کا مکمل ازالہ کیا جاسکے۔

(۱) واقعۂ تحویلِ قبلہ :

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ رَحِيْمٌ (۱)۔ ''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر مشفق (اور) مہربان ہے۔''

سیاق وسباق کے اعتبار سے ہم نے آیت میں ''الناس'' (لوگوں) سے مومنین مراد لئے ہیں۔ مثلاً درج ذیل قرآنی آیات کے اجزاء میں ''الناس'' (لوگوں) سے بالاتفاق مومنین مراد ہیں: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (۲) ''اور لوگوں پر اللہ کے لئے (اللہ کے) گھر (خانہ کعبہ) کا حج (فرض) ہے جو وہاں تک جانے کی توفیق رکھتا ہو''۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ

قَالُوْا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (۳) ''اور جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم بھی (اسی طرح) ایمان لائیں جیسے بیوقوف ایمان لائے؟''

چنانچہ ہم نے زیر بحث آیت کے حصہ'' اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ رَحِيْمٌ ''میں ''الناس'' سے مومنین مراد لئے ہیں جو نزول آیت کے موقع پر اس وقت کے اصحاب رسول ﷺ تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے اصحاب پر مشفق ومہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ جن پر مہربان ہو وہ ہرگز جہنم میں نہیں جاسکتے۔ یوں آیت سے ان صحابہ کرامؓ کا ارتداد سے محفوظ رہنا اور آخرت میں مغفور ومرحوم ہونا بخوبی ثابت ہے۔ اگر یہاں آیت میں ''الناس'' (لوگوں) کے مفہوم کو عام رکھا جائے اور اس سے مومنین وکفار سب مراد لئے جائیں تو بھی ہمارا استدلال متاثر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں بھی آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اس دنیا میں جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مومنین اور کفار سب کو حاصل ہے تو عالم آخرت میں وہ مومنین (صحابہ کرامؓ) اس کی رحمت سے ہرگز محروم نہ ہوں گے جن کے ایمان کے محفوظ اور قائم ودائم رہنے کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے کیونکہ اخروی رحمت کے مستحق صرف مومنین ہی ہوں گے۔ کفار ومنافقین اس سے یکسر محروم رہیں گے۔

(۲) منافقین اور قرآن کریم :

(الف) منافقین پر سختی اور ان کی ذلت ورسوائی: سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ساتھی اور دوست ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برے کاموں سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومنین اور مومنات سے ایسی جنتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہنے کے باغات میں ان کے لئے پاکیزہ گھر ہوں گے اور اللہ کی خوشنودی ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر (نعمت) ہے۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اس بعد ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (۴)۔ ''اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور (وہ) برا ٹھکانا ہے۔''

سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! اللہ سے سچی توبہ کرو، بہت ممکن ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمہیں جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں چلتی

ہوں گی جس دن اللہ نبی کو اور جو (اصحاب رسول اللہ) اس نبی کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ وہ کہتے ہوں گے اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہمارے نور کو مکمل فرما اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس کے بعد ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ وَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ط وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (۵)۔

یوں کفار اور منافقین کے خلاف جہاد اور ان پر سختی کرنے کے حکم والی یہ آیت سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم دونوں میں موجود ہے اور دونوں جگہ اس آیت کا سیاق وسباق ظاہر کر رہا ہے کہ مومنین سے کفار و منافقین کا امتیاز مقصود ہے تاکہ کسی کج فہمی یا عناد و شرارت کی بنا پر کسی بھی صحابیٔ رسول کو منافق یا کافر قرار دینے کا کسی کو بہانہ ہاتھ نہ لگے۔ جیسا کہ مقالے کے ابتدائی حصے میں واضح کیا جا چکا ہے منافقین پر سختی کرنے اور (زبان سے) ان کے خلاف جہاد کرنے کا کم سے کم تقاضا یہ بھی ہے کہ ان سے معاشرتی روابط میں سخت احتیاط برتی جائے تو اپنے جن اصحاب سے رسول اکرم ﷺ نے رشتے ناطے قائم فرمائے وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ جن صحابہ کرامؓ نے اپنی خوشی اور رضامندی سے اپنی بیٹیاں رسول اکرم ﷺ کی زوجیت میں دینے کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کی وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ ہاں جن ازواج مطہرات کے سرپرست اور رشتے دار اس رشتۂ زوجیت کے موقع پر حالتِ کفر میں تھے اور اسی حالت میں رہتے ہوئے مر گئے یا اس موقع سے پہلے ہی وہ حالتِ کفر میں مر چکے تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس بشارت میں بوجہ کفر شامل نہیں کیونکہ ان ازدواجی رشتوں میں کفار کی رضامندی ہونے یا نہ ہونے کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ کافر بوجہ کفر کسی مسلمان کا ولی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جن اصحاب کے گھروں میں آپ کی بیٹیاں گئیں، وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے جن اصحاب کو اہم مناصب پر فائز فرمایا اور جنہیں وحی جلی (قرآن کریم) اور وحی خفی (مثلاً عام مکتوبات) کی کتابت پر مقرر فرمایا اور جن کی سربراہی میں اہم سرایا ہوئے، وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ غزوۂ حنین اور غزوۂ ہوازن کے بعد آپ نے انتہائی بیش قیمت مال غنیمت مکہ مکرمہ میں مقیم اپنے ان اصحاب کو دیا جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور ان کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تالیف قلب (دلجوئی) فرمائی اور مؤلفۃ القلوب کہلائے، یہ لوگ ہرگز ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ آپ نے اس موقع پر مہاجرین مکہ کو بہت کم اور انصار مدینہ کو کچھ بھی نہیں دیا تھا حالانکہ وہ بھی ان غزوات میں شریک تھے۔ اگر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے یہ مؤلفۃ القلوب حضرات منافق ہوتے یا منافق ہی رہتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ہرگز اس تالیف قلب کی اجازت نہ دیتا۔ بے شک بعض اوقات

حسبِ موقع وضرورت کفار ومنافقین کو بھی نفلی صدقات دیے جاسکتے ہیں اور مدینہ منورہ میں منافقین بھی بعض اوقات یہ صدقات حاصل کرتے رہے، خصوصاً جب کہ ان کا نفاق ابھی مخفی تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ کسی غزوہ میں حقیقۃً شریک مومنین یعنی مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کو غنائم وصدقات سے محروم رکھ کر منافقین کی تالیف قلب (دلجوئی) کی گئی ہو۔ پس فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے ان مؤلفۃ القلوب کا نفاق سے فوراً یا بالآخر بری ہونا بالکل واضح ہے۔ اس کی تائید دیگر ان قرآنی آیات سے بھی بخوبی ہورہی ہے جو قبل ازیں ہم حسب موقع پیش کر چکے ہیں۔ منافقین پر سختی کرنے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے طبعی اسباب کے تحت ان پر سختی ہونے کے متعلق قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۶)۔ ''اور تمہارے اردگرد (رہائش پذیر) بدوؤں میں سے کچھ منافق ہیں اور مدینہ کے رہنے والوں میں سے بھی کچھ منافقت پر ڈٹے ہوئے ہیں (اے پیغمبر!) تو انہیں نہیں جانتا ہم انہیں جانتے ہیں۔ ہم انہیں عنقریب دو مرتبہ عذاب دیں گے اور پھر انہیں ایک بڑے عذاب کی طرف پھیرا جائے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کو دو قسموں میں منقسم کر دیا۔ ایک وہ اعراب (بدوی لوگ) جو مدینہ منورہ کے پڑوس کے علاقوں اور بستیوں میں رہائش پذیر تھے۔ دوسرے خاص مدینہ منورہ کے رہنے والے منافق تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہاجرین مکہ (جن میں خلفائے راشدینؓ بھی شامل ہیں) میں سے کوئی بھی منافق نہ تھا کیونکہ یہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ مدینہ ان کا آبائی وطن نہ تھا۔ مکہ میں یہ حضرات کفار کے مقابلے میں کمزور تھے تبھی تو ہجرت پر مجبور ہوئے تھے اس لئے ان کا (معاذ اللہ) ازراہ نفاق اسلام قبول کرنا خلافِ عقل بھی ہے۔ مدینہ منورہ کے بعض منافقین کا نفاق اس قدر گہرا تھا کہ رسول اکرم ﷺ اپنی فراستِ کاملہ اور روشن ضمیری کے باجود وحی کے بغیر ان کے نفاق سے باخبر نہ ہو سکتے تھے۔ ان منافقین کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ انہیں آخرت کے بڑے عذاب سے پہلے بھی دو مرتبہ عذاب دیا جائے گا۔ اگر ان میں سے ایک عذاب قبر کا عذاب ہو تو بھی دنیا میں کم از کم ایک عذاب کا انہیں سامنا ہوگا اور یہی عذاب کیا کم ہے کہ دنیا میں ان کے نفاق کو ظاہر کر کے ان کی فضیحت کی جائے اور اپنی جن باتوں کے ظاہر ہونے سے وہ ڈرتے ہیں، وہ ظاہر ہو کر رہیں چنانچہ ایسا یقیناً ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ الایۃ (۷) ''یعنی اللہ ایسا نہیں ہے کہ مومنین کو اسی حال پر چھوڑے رکھے جس پر تم اب ہو جب تک وہ

خبیث (منافقین) کو پاکیزہ (مومنین) سے الگ نہ کردے۔''

نیز ارشاد ہے: یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (۸) ''منافقین اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے متعلق کوئی ایسی سورت نہ اتاری جائے جو ان کے دلوں کی باتوں کو (اجمالاً یا تفصیلاً) ان پر کھول دے۔ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ تم ٹھٹھے اڑالو، بلاشبہ اللہ ان تمام باتوں کو (وحی جلی یا خفی کے ذریعے) ظاہر کرنے والا ہے جن سے تم ڈرتے ہو۔''

پس عام اصحاب عموماً اور خلفائے راشدین خصوصاً منافقین سے متعلق ان آیات کے مصداق سے خارج ہیں، خصوصاً پہلے دو خلفا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو دنیا میں بھی بے حد غلبہ، عزت اور ترقی حاصل ہوئی۔ یہ خیال اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ منافقین کے لئے دنیا کا عذاب ان کے اموال و اولاد کی صورت میں بھی تھا لیکن اس سے مذکورہ نوعیت کے عذاب کی ہرگز نفی نہیں ہوتی بلکہ اس کا ثبوت تو خود کتاب اللہ سے مل رہا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ وَ اِنْ یَّتَوَلَّوْا یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ (۹) ''تو اگر (یہ منافقین رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے) سے توبہ کرلیں تو اسی میں ان کے لئے بہتری ہے اور اگر وہ منہ پھیرتے ہیں تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور زمین میں ان کا کوئی ساتھی اور حمایتی نہ ہوگا۔''

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ اور اصحاب کے دور کے منافقین کو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی عذاب ہوگا اور یہ کہ دنیا میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا جس کی حمایت اور مدد سے انہیں دنیا میں کامیابی اور سرخروئی حاصل ہو۔ یہ تو پہلے ثابت ہو چکا کہ اپنے جن ساتھیوں سے رسول اکرم ﷺ نے عمر بھر بہترین معاشرتی روابط قائم کئے اور بحال رکھے وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ یہاں آیت میں بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور ان کے ساتھیوں کا مؤمن کامل ہونا اور ان کی خلافت کا صحیح ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو رہا ہے کہ انہیں دنیا میں مسلمانوں کی زبردست حمایت حاصل ہوئی۔ جتنے مددگار اور دوست ان کے ہوئے کبھی کسی اور کے اتنے نہیں ہوئے۔ ان کے زمانے سے لے کر اب تک مسلمانوں کی زبردست اکثریت کی نصرت وحمایت انہیں حاصل رہی ہے اور رہے گی۔ اگر یہ حضرات منافق ہوتے تو مذکورہ آیت کے بموجب انہیں دنیا میں یہ ولایت وحمایت ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ سورۂ احزاب میں ہے: لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی

الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا O مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا O سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْ مِنْ قَبْلُ ج وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا O (۱۰)

''اگر یہ منافقین اور جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں سنسنی خیز (جھوٹی) خبریں اڑاتے ہیں (اپنی ان حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ہم ضرور بالضرور تجھے ان کے پیچھے لگا دیں گے (اور ان پر تجھے مسلط کر دیں گے) پھر یہ لوگ تیرے پڑوس میں تھوڑا عرصہ ہی رہ سکیں گے۔ ملعون ہوں گے جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے پکڑ لئے جائیں گے اور خوب قتل کئے جائیں گے۔ اللہ کا یہ قانون ہے جو ان لوگوں پر بھی جاری رہ چکا ہے جو پہلے گزر چکے اور تو اللہ کے اس قانون میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔''

اس آیت نے تو منافقین اور مومنین کے درمیان زبردست امتیاز پیدا کر دیا کیونکہ اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جو منافقین بھی اپنے نفاق پر قائم رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہیں گے۔ انہیں دنیا میں بھی یہ سزائیں ضرور ملیں گی کہ رسول اکرم ﷺ کو ان پر مسلط کر دیا جائے گا۔ یہ منافقین آپ کے پڑوس میں تھوڑی مدت کے لئے ہی رہ سکیں گے اور یہ مدت آپ کی اس دنیا سے رحلت سے قبل ہی ختم ہو جائے گی کیونکہ آپ کے وصال مبارک کے بعد کسی منافق کا دینوی زندگی میں آپ ﷺ کا پڑوسی ہونا خارج از بحث ہے۔ یہ منافقین مدینہ سے بھاگ کر جہاں بھی جائیں گے وہیں پکڑے جائیں گے اور قتل کئے جائیں گے۔ رسول اکرم ﷺ کے دور کے ان منافقین کو ان سزاؤں کا ملنا اللہ تعالیٰ کا ایسا قانون ہے جو گذشتہ زمانوں میں بھی تھا ورنہ منافقین کے منصوبے کامیاب ہو جائیں تو رسول کی بعثت (معاذ اللہ) بے مقصد ٹھہرے گی۔ اس آیت سے اصحاب ثلٰثہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کا نفاق سے بری ہونا اور ان کی خلافت کا حق ہونا بالخصوص ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ حضرات (معاذ اللہ) منافق ہوتے تو یقیناً انہیں مدینہ منورہ سے نکال دیا جاتا اور ہرگز رسول اکرم ﷺ کے وہ مستقل پڑوسی نہ رہتے بلکہ مدینہ منورہ سے باہر بھی جاتے تو بھی یقیناً رسول اکرم ﷺ کے حکم سے ماخوذ و مقتول ہوتے۔ خوارج اس آیت کو سیدنا حضرت علیؓ پر چسپاں نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کا عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی کے ہاتھوں مقتول ہونا (معاذ اللہ) رسول اکرم ﷺ کے حکم سے نہ تھا نیز آپ رسول اکرم ﷺ کی دینوی زندگی میں مدینہ ہی میں رہے اور آپ کے انتقال کے بعد بھی عرصہ دراز تک مدینہ ہی میں رہے حالانکہ آیت سے واضح ہے کہ شر پسند منافقین کا رسول اکرم ﷺ سے پڑوس آپ کی حیات طیبہ میں ہی ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما بھی (معاذ اللہ) رسول اکرم ﷺ کے حکم سے مقتول نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے کبھی مدینہ

چھوڑا۔ شیخین حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو تو رسول اللہ ﷺ کا ایسا پڑوس حاصل ہوا کہ موت کے بعد بھی آپ کے پہلو میں مدفون ہیں اور حضرت عثمانؓ بھی مدینہ منورہ ہی میں مدفون ہیں۔ یہاں یہ عذر کرنا لغو ہے کہ یہ آیت ان منافقون کے متعلق ہے جو جنگ کے متعلق بری خبریں پھیلاتے تھے اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، ایذا رسانی بھی کرتے تھے پھر وہ لوگ ان شرارتوں سے باز آ گئے لہٰذا اس آیت کا مصداق نہ ہوئے کیونکہ اگر یہ مفروضات قائم کئے جائیں کہ رسول اکرم ﷺ کسی کے لئے پروانۂ خلافت لکھوانا چاہتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے (معاذ اللہ) رکاوٹ کھڑی کر دی حالانکہ اس سے پہلے انہیں (جھوٹے) مفروضات کے تحت حجۃ الوداع میں غدیر خُم کے مقام پر اس خلافت کا صاف اعلان بلکہ بیعت بھی ہو چکی تھی۔ رسول اکرم ﷺ اپنی دنیوی زندگی کے آخری ایام میں حضرت اُسامہؓ کا لشکر بھیجنا چاہتے تھے لیکن ان مفروضات کے مطابق (معاذ اللہ) حضرات شیخینؓ نے یہ مہم روانہ نہ ہونے دی۔ امہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے انہی مفروضات کے تحت (معاذ اللہ) رسول اکرم ﷺ کو زہر دیا تھا جس سے آپ نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ رسول اکرم ﷺ کے دور ہی میں اور آپ کی رحلت کے فوراً بعد سیدنا حضرت علیؓ کے خلاف (معاذ اللہ) سازش کی اور ان سے خلافت چھین لی۔ سیدہ فاطمہؓ سے (معاذ اللہ) باغ فدک چھین لیا۔ حضرت علیؓ سے (معاذ اللہ) جبراً بیعت لی۔ سیدہ فاطمہؓ کو (معاذ اللہ) ناقابل بیان جسمانی اذیت بھی پہنچائی، ان کے گھر کو جلایا گیا (معاذ اللہ) تراویح کی بدعت جاری کی گئی، (مفروضہ حلال) متعہ کو حرام قرار دیا گیا۔ قرآن کریم میں کم از کم اتنی تحریف تو (معاذ اللہ) ہوئی کہ حضرت علیؓ نے مبینہ طور پر جو قرآن ترتیب نزولی کے تحت جمع فرمایا تھا، اسے قبول ہی نہ کیا گیا اور نہ ہی چلنے دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ تو ان مفروضات کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں کون عقل مند یہ کہے گا کہ یہ حضرات عام ایذا رسانی تو ایک طرف رہی اسلام اور مسلمانوں کو (معاذ اللہ) زبردست نقصان پہنچانے سے باز آ گئے تھے کہ زیر بحث آیت کے مصداق سے باہر نکل جاتے؟ رسول اکرم ﷺ کے دور ہی میں اور آپ کے وصال مبارک کے فوراً بعد ان مفروضہ افعال شنیعہ سے زیادہ لرزہ خیز اور زلزلہ برپا کرنے والے اور کون سے کام ہو سکتے تھے حتیٰ کہ انہی مفروضات کے تحت شیخینؓ وغیرہ نے رسول اکرم ﷺ کی تجہیز و تکفین اور جنازے تک میں (معاذ اللہ) شرکت نہ کی۔ اگر یہ مفروضات صحیح ہیں تو زیر بحث آیت کا مصداق ان لوگوں سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے؟۔ یہ کہنا بھی بے معنی ہے کہ شیخینؓ کو روضۂ رسول میں دفن ہونے سے جو شرف اور مرتبہ حاصل ہوا وہ کبھی کعبہ میں بتوں کو بھی حاصل تھا۔ یہ بات تب درست ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی پیغمبر کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا ہوتا کہ خانہ کعبہ میں کبھی بت نہیں ہوں گے اور اگر ہوئے تو قلیل مدت کے لئے

ہوں گے۔ یہاں اس آیت کا حوالہ بھی غیر متعلق ہے: وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۱۱) ''اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسری کا کھاری ہے چھاتی جلانے والا اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔''

اس آیت کا حوالہ یہاں تب درست ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہوتا کہ کڑوے پانی کی لہر میٹھے پانی کے پڑوس میں نہیں رہ سکتی اور اگر رہی بھی تو تھوڑی مدت کے لئے رہے گی کیونکہ منافقین سے متعلق مذکورہ بالا آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ منافقین تھوڑی مدت کے بعد سرے سے رسول اللہ ﷺ کے پڑوس میں ہی نہیں رہیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح کڑوے پانی کو اس کے پڑوس میں بہنے والے میٹھے پانی کی لہر کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اسی طرح حضرات شیخینؓ کو رسول اکرم ﷺ کے پڑوس سے فائدہ نہ ہوگا تو یہ تب درست ہوتا اگر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق یہ فرمایا ہوتا کہ یہ منافقین رہیں گے تو رسول اکرم ﷺ کے پڑوس میں ہی مگر اس پڑوس کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آیت کا مضمون تو یہ ہے کہ ان منافقین کو اس پڑوس سے ہی سرے سے محروم کر دیا جائے گا۔ عدم جوار (پڑوس نہ ہونے) اور عدم افادۂ جوار (پڑوس کے فائدہ نہ پہنچانے) میں زمین و آسمان کا فرق ہے لہٰذا اس طرح کے تمام شبہات باطل ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کے کلمات خواہ کسی بھی غیر معصوم کی زبان و قلم سے نکلے ہوں، قطعاً غلط اور خلافِ حقیقت ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مدینہ منورہ ایسے منافقین سے (معاذ اللہ) بھرا ہوا تھا جو اسلام اور اس وقت کے حاملینِ اسلام صحابہ کرامؓ کو کوئی گزند پہنچانے پر قادر تھے۔

ان تمام آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے دور کے یہ شر پسند منافقین آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوئے۔ اس کے برعکس مہاجرین مکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۱۲) ''اور جن لوگوں نے مظلوم ہونے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کی ہم ضرور بالضرور انہیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا (اجر) ہے اگر ان لوگوں کو علم ہو۔''

نیز ارشاد ہے: فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۳) ''تو جن لوگوں نے ہجرت کی اور جنہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میرے راستے میں انہیں تکلیف پہنچائی گئی تو میں ضرور بالضرور ان کے گناہ معاف

کروں گا اور میں ضرور بالضرور انہیں باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی۔ یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ کے پاس بہترین اجر ہے۔''

اس طرح کی آیات سے معلوم ہوا کہ مہاجرین مکہ کو عموماً اور ان میں سے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو خصوصاً اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بہترین ٹھکانا دیا، عزت وغلبہ عنایت فرمایا۔ آخرت کی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ان میں سے جو اس دنیا میں طبعی موت سے رخصت نہیں ہوئے بلکہ فی سبیل اللہ مقتول ہو کر شہداً میں شامل ہوئے وہ بھی اجر عظیم کے مستحق ٹھہرے اور مغفور ومرحوم ہوئے۔ پس وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ وہ مرتد بھی نہیں ہو سکتے ورنہ سورۂ مائدہ کی آیت قتالِ مرتدین کی رو سے مغلوب ومقہور ہوتے (۱۴)۔

ایک شبہہ کا ازالہ :

منافقین سے متعلق سلسلۂ آیات میں سورۂ محمد کی ایک آیت یہ ہے: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ (۱۵)۔

لغوی معنی کے اعتبار سے ''ان تولیتم'' کا ایک معنی تو یہ ہے ''اگر تم نے اعراض کیا، تم نے منہ پھیرا'' دوسرا معنی یہ ہے ''اگر تم حاکم ہو جاؤ'' قرآن کریم میں لفظ ''تولیتم'' کل آٹھ مرتبہ آیا ہے۔ مذکورہ آیت کے علاوہ جن آیات میں یہ لفظ موجود ہے، ان کے متعلقہ حصے یہ ہیں: ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ (۱۶) ''پھر تم اس کے بعد (عہد سے) پھر گئے'' ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (۱۷) ''پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے لوگ (عہد پر قائم رہے) اور تم تو پھر جانے والے لوگ ہو'' فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۱۸)۔ ''پھر اگر تم پھر جاؤ تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو (احکام) صاف صاف پہنچا دینا ہے'' وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ (۱۹)۔ ''اور اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے'' فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ (۲۰)۔ ''تو اگر تم منہ پھیرو تو میں نے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگی ہے میری اجرت تو اللہ کے ذمہ ہے'' وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۱) ''اور اگر تم نے ایسے ہی منہ پھیرا جیسے تم نے پہلے پھیرا تھا تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا'' فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۲۲)۔ ''پھر اگر تم منہ پھیرو تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صرف (احکام کا لوگوں تک) پہنچا دینا ہے۔''

جب ان سات مقامات پر ''تولیتم'' کا معنی بالاتفاق اعراض اور منہ پھیرنے کا ہے تو کوئی

وجہ نہیں کہ سورۂ محمد کی مذکورہ زیر بحث آیت میں اسی معنیٰ کو ترجیح نہ دی جائے جبکہ سیاق وسباق سے بھی اسی کی تائید ہو رہی ہے۔ آیت کا ترجمہ یوں ہوگا ''(اے منافقو!) تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم (اسی طرح قتال فی سبیل اللہ سے) کنارہ کش رہو تو تم دنیا میں فساد مچا دو اور آپس میں قطع قرابت کرو''۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ اور اردگرد کے یہ منافقین جب جہاد سے کنارہ کشی کریں گے اور مسلمانوں کی بجائے در پردہ کفار کا ساتھ دیں گے تو ان کا یہ فعل زمین میں فتنہ وفساد کو ترقی دینے اور اپنے ہی نسبی اور وطنی بھائیوں سے قطع تعلق اور غداری کے مترادف ہوگا۔ پس یہاں '' ان تولیتم '' کا معنیٰ ''اگر تم حاکم بن جاؤ'' لینا مرجوح ہے۔ لیکن اگر اسی معنیٰ پر اصرار کیا جائے تو اس آیت کا اطلاق رسول اکرم ﷺ کے اصحاب پر ہونا تو درکنار، آپ کے دور کے منافقین پر بھی اس مفہوم میں قطعاً باطل ہے کہ انہیں کبھی حکومت بھی حاصل ہوگی کیونکہ رسول اکرم ﷺ کے دور کے معاند وشریر منافقین کی قسمت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرما دیا کہ یہ ذلیل وخوار ہونگے، رسول اکرم ﷺ کے پڑوس میں زیادہ دیر نہیں رہ سکیں گے بلکہ جہاں بھی جائیں گے آپ کے حکم سے ماخوذ ومقتول ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک ہی حال پر نہیں چھوڑے رکھے گا جب تک کہ وہ ان خبیث منافقین کو پاکیزہ مسلمانوں سے الگ تھلگ نہ کر دے۔ ان منافقین کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ان کے نفاق کو ظاہر کر دینے والی کوئی سورت نازل نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ (بذریعہ وحی جلی یا خفی) ان شریر ومعاند منافقین کے ان تمام خفیہ بھیدوں کو ظاہر کرے گا جن کے ظاہر ہونے سے وہ خوف زدہ ہیں پھر اسی سورۂ محمد میں ہے: اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ O وَلَوْنَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ O (۲۳) ''جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے انہوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ اللہ ان کے بھید ہرگز نہیں کھولے گا؟ اگر ہم چاہتے تو (اے پیغمبر) ہم یہ لوگ تجھے دکھلا دیتے اور تو انہیں ان کے (ظاہری) نشان سے پہچان لیتا اور تو ضرور بالضرور انہیں ان کے طرزِ کلام سے پہچان لے گا اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔''

نیز صحابہ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ نے دیگر سورتوں کے علاوہ اسی سورۂ محمد میں بھی غلبے کی بشارت دی ہے: فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۳۴) ''تو تم ہمت نہ ہارو اور (دشمنوں کو) صلح کے لئے نہ پکارو اور تم ہی غالب ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال میں تمہیں نقصان نہیں دے گا۔''

اسی سورۂ محمد کے آخر میں صحابہ کرام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم (دین کے معاملے میں مطلوبہ

معیار پر پورے نہ اترتے ہوئے احکام خداوندی سے) منہ پھیرنے لگو (اور اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کرو) تو اللہ تعالیٰ تمہاری بجائے کوئی اور قوم لے آئے گا پھر وہ تمہاری طرح کے نہ ہوں گے، صحابہ کرامؓ کی جگہ اللہ تعالیٰ ہرگز کسی اور قوم کو نہیں لایا۔ قرآنی پیشگوئیوں اور بشارتوں کے مطابق وہ غالب اور کامیاب و کامران ہوئے اور اس دور کے منافقین اگر تائب نہیں ہوئے تو وہ اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں ناکام اور خائب و خاسر ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے دور کے بعد کے بنوامیہ اور بنوعباس کے بعض ظالم حکمرانوں میں سے سب پر یا کسی پر بھی زیر بحث آیت کے مرجوح مفہوم کو چسپاں کرنے کے ہم مکلف اور پابند نہیں ہیں۔ پھر ایسا فیصلہ بہرحال ظنی ہوگا جس میں خطاء کا احتمال ہے کیونکہ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ظالم حکمراں نظری واعتقادی اعتبار سے لازماً منافق بھی ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ جملہ شرطیہ میں پائی جانے والی شرط اور جزاء کا خارج میں لازماً ظہور بھی ہو۔ چند ایسے حکمران بالفرض منافق بھی ہوں تو ان کے سب کے سب اعلیٰ وادنیٰ درجہ کے ماتحت اور ساتھی بھی (معاذ اللہ) ایسے منافق نہیں ہوگئے تھے کہ قرآن کریم اور سنت رسول کا آئندہ نسلوں تک منتقل ہونا محال ہو جائے۔ ایسے مفروضات کی بنا پر قرآن کریم کو (معاذ اللہ) محرف قرار دینے کی ناپاک مساعی ہرگز نہ بارآور ہوسکی ہیں اور نہ ہوں گی۔

غزوۂ احد میں بعض صحابہ کرام سے پہاڑی درہ اور میدانِ جنگ چھوڑنے کی لغزش سرزد ہوئی جس سے مسلمانوں کو عارضی مگر شدید نقصان پہنچا۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے۔ غزوہ میں شہید ہونے والے ستر شہدا میں آپ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی متعدد آیات میں اس ظاہری و عارضی نقصان کی حکمتیں بیان فرمائیں۔ صحابہ کرامؓ کی لغزشوں کی نشاندہی فرمائی۔ اصلاح وتربیت کے لئے نصیحتیں فرمائیں تو ساتھ ہی اپنی طرف سے مغفرت و رحمت اور غلبۂ اسلام کی بشارتیں بھی دیں۔ بعض صحابہ کرامؓ نے میدان جنگ اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ رسول اکرم ﷺ کی شہادت کی جھوٹی خبر پھیل گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ O (۲۵) ''محمد تو (اللہ کی طرف سے) رسول ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہوگزرے ہیں تو کیا اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو (اے مسلمانو!) کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو شخص بھی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ ہرگز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو اچھا صلہ دے گا۔''

اس آیت میں محض یہ تنبیہ مقصود ہے کہ رسول اکرم ﷺ اس دارِ فانی سے رحلت بھی فرما

جائیں تو صحابہ کرامؓ دین پر قائم رہیں اور گھبرائیں نہیں۔ چنانچہ اصحاب آپ کے وصال مبارک کے بعد بھی دین پر قائم ودائم رہے ورنہ اگر وہ فی الواقع مرتد ہونے والے ہوتے تو علام الغیوب اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز دومرتبہ ان کی معافی کا اعلان نہ فرماتا نہ ہی اپنے رسول کو یہ حکم دیتا کہ آپ بھی نہ صرف انہیں معاف کردیں بلکہ ان کے لئے استغفار بھی کریں اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی لیا کریں نیز اللہ تعالیٰ شہدائے احد کو یہ بشارت نہ دیتا کہ ان کے جو ساتھی دنیا میں رہ گئے ہیں ان پر بھی کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہوں گے چنانچہ آپ کے انتقال کے بعد مانعین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف بھرپور قتال و جہاد صحابہ کرامؓ نے خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پرجوش اور ولولہ انگیز قیادت و رہنمائی میں کیا۔ صحابہ کرامؓ غالب ومنصور ہوئے اور سورۂ مائدہ کی آیت قتالِ مرتدین (۲۶) کے بموجب مرتدین مقہور ومغلوب اور خائب وخاسر ہوئے۔

(ب) کفار ومنافقین سے اعراض کا حکم، ان پر سختی کرنے کے حکم کے خلاف نہیں ہے:

بعض قرآنی آیات مثلاً درج ذیل قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ اور مومنین کو کفار ومنافقین سے اعراض (بے رخی کرنے) کا حکم دیا ہے: سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۲۷) ''جب تم ان (منافقین) کے پاس لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے روبرو اللہ کی قسم کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ سوتم ان کی طرف التفات نہ کرو یہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے ان کاموں کے بدلے میں جو وہ کررہے ہیں'' اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (۲۸) ''اللہ ان (ان منافقین) کے دلوں میں جو کچھ ہے خوب جانتا ہے۔ سوتو ان کی (تکلیف دہ باتوں کی) پرواہ نہ کر، انہیں نصیحت کر اور ان سے ایسی باتیں کر جو ان کے دلوں میں اثر کر جائیں'' لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۲۹)۔ ''اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تو مشرکین سے کنارہ کشی کر'' وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○ (۳۰) ''اور تو کافروں اور منافقوں کا کہنا مان اور ان کی ایذاؤں کو نظر انداز کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔ اللہ بطور کارساز کافی ہے۔''

اس طرح کی آیات سے بخوبی واضح ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ کفار ومنافقین کی چھوٹی بڑی تمام کی تمام حرکات وسکنات پر نظر رکھنے اور ان پر کڑھتے

رہنے کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ایسا کرنے سے اصل فرائض یعنی دینِ اسلام پر پختگی سے قائم رہنے اور اس دین کی نہایت مؤثر اور غالب انداز میں دوسروں کو تبلیغ کرنے اور اس کی حفاظت کرنے میں رکاوٹ اور خلل پیدا ہوگا، خاصا وقت بھی ضائع ہوگا اور ان کی ان حرکات پر خواہ مخواہ کا رنج والم بھی ہوگا۔ مثلاً مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ اپنے اصحاب کو وعظ ونصیحت فرماتے، ان سے محوِ گفتگو ہوتے تو جو حضرات کسی بات کو سمجھ نہ پائے ہوں یا جو حضرات مجلس میں تاخیر سے پہنچے ہوں اور انہوں نے پوری بات نہ سنی ہو تو وہ نہایت ادب سے لفظ ''راعنا'' کہتے تھے کہ (اے اللہ کے رسول!) ہماری رعایت فرمایئے یعنی ہمیں دوبارہ سمجھا دیجئے۔ کبھی یہودی بھی خصوصاً یہودی منافقین بھی ان مجالس میں شریک ہوتے تو وہ اس لفظ ''راعنا'' کو بدنیتی سے بگاڑ کر کہتے جس سے معنیٰ توہین آمیز ہو جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم ''راعنا'' نہ کہا کرو اس کے بجائے ''انظرنا'' کہا کرو (۳۱) ''انظرنا'' کا معنی ہے کہ ہماری طرف بھی نظرِ کرم فرمایئے۔ تو یہاں مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم ان یہودیوں اور منافقوں پر گہری نظر رکھو اور جونہی کوئی اس طرح کی شرارت کرتا نظر آئے تو اس کی گوشمالی کرو۔ اگر ایسا حکم دیا جاتا تو مسلمان اپنے اصل فریضہ (رسول اکرم ﷺ سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے) سے غیر شعوری طور پر غافل ہو جاتے اور منافق یہودیوں کی اس طرح کی نگرانی کر کے خواہ مخواہ کا دردِ سر مول لے کر پریشان بھی ہوتے۔ غور کیا جائے تو اس طرح کا یہ اعراض (کنارہ کشی) بھی دراصل غلظت (سختی کرنے) کی ہی ایک صورت ہے۔ بسا اوقات کینہ پرور شریر لوگوں کی عام شرارتوں کی طرف بالکل توجہ نہ دینا اور اعراض (بے رخی) سے کام لینا ان شریروں کے لئے ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے اور وہ اپنی بہت سی بیہودہ حرکات اور گھٹیا شرارتوں کو از خود چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر اکثر وبیشتر یہ اِعراض (کنارہ کشی) نفرت اور بیزاری کے اظہار کی علامت بھی ہے۔ اگر بعض حالتوں میں اِعراض سے مراد معاف کر دینا اور درگزر سے کام لینا بھی لیا جائے تو بھی اس طرح کی آیات کا ان آیات سے ہرگز کوئی تعارض نہیں ہے جن میں کفار ومنافقین سے جہاد کا اور ان پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر موقع اور محل کے لئے احکام الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں کہ اعراض کے موقع پر اعراض اور جہاد اور سختی کرنے کے موقع پر جہاد اور سختی سے کام لیا جائے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں حقیقی تعارض ہرگز ممکن نہیں کہ کلام میں ایسا تعارض عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ لہٰذا اعراض (کنارہ کشی اور بے توجہی) والی آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے کفار ومنافقین کے خلاف جہاد اور سختی کرنے کے دو مرتبہ دیئے گئے تاکیدی حکم کو (معاذ اللہ) پس پشت ڈال دیا تھا۔ کفار ومنافقین کے خلاف جہاد اور ان پر سختی کرنے کے حکم کی تفسیر میں مفسرین کے بظاہر جو

مختلف اقوال ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں کہ سب جمع نہ ہوسکیں۔ کفار سے جہاد مسلح قتال کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور یہی مسلح قتال منافقین کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، جب کہ وہ اپنے نفاق کو ظاہر کردیں۔ ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ منافقین کے خلاف جہاد ہاتھ اور زبان سے ہوگا۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ کفار کے خلاف جہاد تلوار اور منافقین کے خلاف زبان سے ہوگا۔ حسنؒ، مجاہدؒ اور قتادہؒ کا قول یہ ہے کہ منافقین کے خلاف جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ان پر حدود قائم کی جائیں۔ ضحاکؒ کا قول ابن عباسؓ کے مطابق ہے (۳۲)

غزوۂ احد میں جو مسلمان میدان جنگ چھوڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اپنے رسول کے دل کو نرم کردیا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْ هُمْ فِي الْاَمْرِ (۳۳) ''یہ ان لوگوں پر اللہ کی طرف سے رحمت ہوئی کہ (اے پیغمبر!) تو ان کے لئے نرم خو ہوگیا۔ اگر تو تند خو وسخت دل ہوتا تو وہ تیرے اردگرد سے منتشر ہوجاتے اس لئے تو انہیں معاف کردے، ان کے لئے استغفار کر اور ان سے اہم معاملات میں مشورہ بھی لیا کر۔''

اس آیت کا تعلق صرف اور صرف مسلمانوں سے ہے، منافقین سے ہرگز نہیں کیونکہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمایا تو معافی کے اعلان سے متصل فوراً بعد یہ کہہ کر انہیں ''مومنین'' قرار دیا: وَاللهُ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۴) ''اور اللہ مومنین پر فضل فرمانے والا ہے۔''

نیز کفار ومنافقین کے لئے استغفار سے اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو منع فرمایا ہے۔ پھر منافقین سے مشورہ لینا بھی رسول اکرم ﷺ کے لئے ممنوع تھا کیونکہ جس سے مشورہ لیا جاتا ہے بعض اوقات اس کے مشورے کو قبول بھی کرنا ہوتا ہے۔ اگر رسول اکرم ﷺ کبھی بھی اپنے ساتھیوں کے مشورے کو قبول نہ کرنے کے پابند ہوتے تو ان سے مشورہ لینا ہی بے کار ہوتا اور اللہ تعالیٰ بے کار مشغلے کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ منافقین کا مشورہ اس لئے قابل قبول نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَ دَعْ اَذٰهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (۳۵) ''اور تو کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مان اور ان (کی طرف سے پہنچائی گئی) ایذاؤں کو نظر انداز کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔''

تو جب کفار ومنافقین کی بات ماننے سے آپ کو منع فرمایا گیا ہے تو ان کا مشورہ آپ کیوں قبول فرمائیں گے؟ ہاں اگر کسی خاص موقع پر کسی منافق کا نفاق ابھی آپ پر مخفی رہا ہو یا ابھی پوری طرح نہ کھلا ہو تو اور بات ہے۔ اگر مسلمانوں کے مشورے سے منافقین کی رائے متفق بھی ہو تو بھی یہی سمجھا جائے گا کہ رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کا مشورہ قبول فرمایا ہے نہ کہ منافقین کا۔ تو جب مذکورہ آیت کا تعلق

منافقین سے ہے ہی نہیں تو (بعض اہل علم کا) یہ کہنا بے معنیٰ ہے کہ چونکہ رسول اکرم ﷺ نرم خو تھے اس لئے منافقین پر سختی سے مراد یہ ہے کہ ان پر حدود کے قائم کرنے میں رعایت نہ کی جائے، زبان کی سختی مراد نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی طبعی نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے اصل مستحق صرف مسلمان اور ان کے بعد غیر معاند کفار ہیں۔ اس لئے خوش خلق اور نرم طبع ہونے کے ساتھ ساتھ مناسب مواقع پر آپ کو شریر منافقین اور معاند کفار کے خلاف جہاد اور سختی کا خصوصی حکم دیا گیا لہٰذا آپ زبان سے بھی ان پر سختی فرماتے تھے جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ضحاکؒ کے تفسیری اقوال سے واضح ہے۔ نیز مثلاً قرآن مجید میں مسلمانوں (اصحاب رسول) کے خلاف غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے والے معاند منافقین کے خلاف رسول اکرم ﷺ کو ان الفاظ سے بددعا کرنے کا حکم ہے ''مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (۳۶) ''تم اپنے غصے میں مرجاؤ'' تو یہ کہنا کیسے درست ہے کہ آپ زبان سے منافقین پر کبھی بھی سختی نہیں فرماتے تھے؟ جہاں تک اقامتِ حدود کا تعلق ہے تو اگر حدود سے اصطلاحی حدود مثلاً حد سرقہ، حدِ زنا وغیرہ مراد ہیں تو ان میں تو رعایت مسلمانوں کے ساتھ بھی نہیں ہوسکتی۔ اس بارے میں منافقین ہی پر سختی کی تخصیص کا دعویٰ درست نہیں۔ ہاں اگر زبان سے سختی سے مراد سب وشتم اور گالی گلوچ ہے تو یہ عام لوگوں کے لئے بھی ممنوع ہے چہ جائیکہ رسول اکرم ﷺ ایسی زبان استعمال فرمائیں۔ الغرض کچھ بھی ہو منافقین پر سختی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ ان سے قریبی معاشرتی روابط مثلاً ان سے رشتے ناطے قائم کرنا ہرگز نہ رکھے جائیں نیز یہ بھی ناگزیر ہے کہ اس طرح کے منافقین کو اگر رسول اکرم ﷺ خود نہ بھی پہچان سکیں تو ان کا نفاق آپ کو بذریعہ وحی معلوم کرایا جائے اور اگر آپ سے اس معاملے میں کبھی خطائے اجتہادی ہو تو اس پر مطلع کیا جائے۔ ورنہ جہاد اور سختی کے حکم کا نزول (معاذ اللہ) عبث ہوگا اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ چنانچہ آپ نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ اس کے مسلمان بیٹے کی دلجوئی کے لئے پڑھائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (۳۷) ''اور تو ان (منافقین) میں سے کسی بھی مرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھ اور نہ ہی تو اس کی قبر پر کھڑا ہو۔''

کفار ومنافقین پر سختی کرنے اور ان کے خلاف جہاد کرنے کے حکم کے نزول سے پہلے رسول اکرم ﷺ ان سے بالفرض ہمہ وقت خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے رہے ہوں تو ایسے حکم کے نزول کے بعد یہ تصور ہی غلط ہے کہ آپ نے ہر حال میں یہ رویہ اپنایا ہو اور کبھی بھی منافقین پر سختی نہ فرمائی ہو لہٰذا ہمارا یہ استدلال اپنی جگہ قائم ودائم ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے جن ساتھیوں سے قریبی

معاشرتی روابط قائم فرمائے اور انہیں بحال رکھا، وہ ہرگز ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔

کفار کے خلاف جہاد وقتال کا حکم صرف رسول اللہ ﷺ ہی کو نہیں بلکہ پوری امت کو ہے جیسا کہ جہاد وقتال فی سبیل اللہ سے متعلق قرآنی آیات سے واضح ہے لیکن منافقین کے خلاف جہاد اور سختی کا حکم صرف رسول اکرم ﷺ ہی کو اس لئے دیا گیا کہ منافق اپنے کفر کو چھپاتا ہے۔ کسی کے دل میں کیا ہے، اس کا یقینی علم خود متعلقہ شخص کو ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو ہے جو عالم الغیب والشھادۃ ہے اور غیب پر یقینی اطلاع وہ بذریعہ وحی صرف رسول اور نبی ہی کو دیتا ہے کیونکہ دوسرے لوگ مورد وحی نہیں۔ ہاں پھر رسول کے ذریعہ دوسروں کو بھی اطلاع ہو سکتی ہے تو منافق کے نفاق کی اطلاع بذریعہ وحی پہلے صرف پیغمبر کو ہی ہو سکتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد دوسروں کو کسی کے نفاق پر یقینی اطلاع نہیں ہو سکتی۔ اگر منافق اپنے نفاق کو خود ظاہر کر دے تو وہ منافق (خفیہ کافر) نہیں رہے گا بلکہ کھلا کافر شمار ہوگا۔

قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے کہ رسول اکرم ﷺ منافقین سے مشورہ نہیں لیا کرتے تھے نیز آپ ان لوگوں سے بھی مشورہ نہیں لیتے تھے جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہوں، جو خواہش نفس کی پیروی کرنے والے ہوں اور جو دین کے معاملے میں افراط وتفریط کا شکار ہوں۔ اسی طرح آپ گناہ پر ڈٹ جانے والے فاسقوں اور ناشکرے لوگوں سے بھی مشورہ نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۳۸)

نیز ارشاد ہے: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۳۹) یہ کہنا درست نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو اپنے ساتھیوں سے مشورے لینے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ ان اصحاب کی تربیت اور دلجوئی ہو گو آپ کبھی بھی ان مشورے کو قبول نہ فرمائیں کیونکہ اگر ایسے زیر تربیت افراد کا ہر مشورہ ہر موقع پر رد کر دیا جائے تو ان کی دل شکنی ہوگی حالانکہ مذکورہ جس آیت میں رسول اکرم ﷺ کو اپنے جن ساتھیوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے اسی سے یہ بھی صاف واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اصحاب رسول کے لئے خاص اہتمام فرمایا ہے کہ ان کی حوصلہ شکنی نہ ہو اور وہ رسول اکرم ﷺ کے اردگرد رہتے ہوئے آپ سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ اگر اصرار کیا جائے کہ رسول اکرم ﷺ صاحب وحی ہونے کی وجہ سے مشورے کے محتاج ہی نہیں تھے لہٰذا آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ محض ان کی دلجوئی کے لئے لیتے تھے اور کبھی بھی ان کے مشورہ کو قبول نہیں فرماتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صحابہ کرامؓ کو بھی اس کا علم تھا کہ ان کا مشورہ کبھی بھی قبول نہیں کیا جائے گا یا علم نہیں تھا؟ اگر علم نہیں تھا تو دوسروں کو یہ علم کیسے

حاصل ہوگیا؟ اگر علم تھا کہ ان کا کوئی مشورہ کسی وقت بھی کسی بھی حال میں ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تو یہ ان کی دلجوئی نہیں بلکہ بڑا کڑا امتحان ہے کہ کون ہر موقع اور ہر معاملے میں اپنی رائے اور مشورے کو نظر انداز کر کے رسول اکرم ﷺ کی رائے کو صدقِ دل سے قبول کرتا ہے اور کون نہیں۔ یقیناً صحابہ کرامؓ اس امتحان میں پورے اترتے لیکن ایسے امتحان کو ہرگز ''دلجوئی'' قرار نہیں دیا جاسکتا اور آیت زیر بحث کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا یہاں مزید کوئی امتحان مقصود نہیں بلکہ اس امر کا اہتمام مطلوب ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے ارد گرد ہی رہیں اور ہرگز منتشر نہ ہونے پائیں تاکہ وہ آپ کی بابرکت صحبت کے فوائد وثمرات سے مسلسل مستفید ہوتے رہیں، اسی لئے کئی مواقع پر رسول اکرم ﷺ نے اپنی رائے کو نظر انداز فرما کر اپنے اصحاب کے مشورے کو قبول فرمایا۔ مثلاً غزوہ احد میں اکابر صحابہؓ کی طرح آپ کا خیال بھی یہی تھا کہ مدینہ منورہ میں ہی رہ کر دشمن کے حملے کو روکا جائے جبکہ نوجوان اصحاب کی رائے یہ تھی کہ مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے آپ نے بالآخر انہی کے مشورے کو قبول فرمایا۔ غزوۂ احزاب میں آپ کا خیال تھا کہ قبیلہ غطفان کو مدینہ منورہ کی پیداوار کا کچھ حصہ دے کر اسے قریش سے الگ کر دیا جائے اور دشمن کی قوت کو کمزور کیا جائے لیکن حضرات سعدینؓ (یعنی انصار مدینہ کے اوس اور خزرج قبائل کے سعدؓ نامی دونوں سرداروں) نے یہ عرض کیا کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو ہم تعمیل کریں گے لیکن اگر آپ کی ذاتی رائے ہے تو ہم نے تو زمانۂ جاہلیت میں بھی ان لوگوں کی ایسی ناز برداری کبھی نہیں کی۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے ہمیں عزت عطا فرمائی ہے ہم انہیں ایک دانہ بھی نہیں دیں گے اور ہمارے اور ان کے درمیان تلوار ہی سے فیصلہ ہوگا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے ان جاں نثار ساتھیوں کا مشورہ قبول فرمایا۔ (۴۰)

مذکورہ تفصیل سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنے جن اصحاب (مثلاً بالخصوص شیخین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما) سے اہم امور میں مشورہ فرمایا کرتے تھے، وہ ہرگز منافق نہ تھے، نہ ہی گناہ پر ڈٹ جانے والے اور ناشکرے تھے، نہ ہی اللہ کی یاد سے غافل تھے، نہ ہی اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والے تھے، نہ ہی دین کے کسی معاملے میں کمی بیشی کرنے اور افراط وتفریط میں مبتلا ہونے والے تھے۔ وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے اور بالفرض کبھی ان سے صغائر وکبائر کا صدور بھی ہوا ہو تو بھی وہ گنہگار اس لئے نہیں تھے کہ وہ اپنی غلطیوں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے تھے ان پر اصرار کرنے والے ہرگز نہ تھے ورنہ رسول اکرم ﷺ ہرگز ان سے مشورہ نہ لیا کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کسی بھی اثم (گنہگار) اور کفور (ناشکرے) کی بات ماننے سے منع فرما رکھا تھا جیسا کہ گزشتہ سطور میں

معلوم ہو چکا۔ آپ اپنے اصحاب سے مشورے لیتے تھے اور بسا اوقات قبول بھی فرماتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرعی و دینی مسائل دو طرح کے ہیں ایک وہ مسائل جو فی نفسہٖ یعنی اپنی اصل کے اعتبار سے ہی دین وشریعت کا حصہ ہیں۔ دوسرے وہ مسائل جو دراصل اس پہلی قسم کے مسائل کے لئے تدابیر اور وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان مسائل پر عمل اور معاشرے میں ان کا نفاذ اور ترویج ان تدابیر اور وسائل پر موقوف ہے لہذا یہ تدابیر و وسائل بھی دین وشریعت کا حصہ بن گئے۔ مثلاً نماز کے فرض ہونے کا مسئلہ پہلی قسم کے دینی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اب باجماعت نماز کے قیام کے لئے مساجد کا قیام ناگزیر ہے پس مساجد کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال بھی ایک دینی مسئلہ بن گئی۔ پہلی قسم کے دینی مسائل کے متعلق اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی جلی (قرآن کریم) یا بذریعہ وحی خفی (حدیث) مطلع فرمایا پھر آپ کے ذریعہ امت مطلع ہوئی۔ دوسری قسم کے بعض مسائل بھی بذریعہ وحی معلوم ہوئے لیکن اس نوعیت کے کئی ایک مسائل میں رسول اکرم ﷺ اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لینے کے مجاز تھے اور اہم امور میں اپنے اصحاب سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ اگر بتقاضائے بشریت آپ سے کبھی کبھار اس اجتہاد میں غلطی ہو جائے مثلاً کسی معاملے میں راجح کی بجائے مرجوح اولیٰ کی بجائے خلافِ اولیٰ صورت اختیار فرمائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازماً اطلاع اور اصلاح ہو جاتی تھی خواہ بذریعہ وحی یا عام دیگر اسباب کے تحت ہو کیونکہ پیغمبر کو ہرگز ہرگز خطائے اجتہادی پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا۔ اسی معنیٰ میں حضرات انبیا علیہم السلام کو معصوم عن الخطا کہا جاتا ہے۔ اس لئے پیغمبر کا اجتہاد بھی وحی کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے وحی میں ہی شامل ہے۔ یوں وحی کی یہاں دو اقسام ہوئیں۔ تنزیلی وحی جو قرآن وحدیث پر مشتمل ہے۔ قرآن کے الفاظ و معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور حدیث میں معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں الفاظ پیغمبر کے ہوتے ہیں۔ غیر تنزیلی وحی پیغمبر کا اجتہاد ہے اسی طرح پیغمبر کی وہ رائے ہے جو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد قائم کی گئی ہو۔ یہاں پیغمبر کو خطا پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے متعلق سورۂ نجم میں ارشاد ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۴۱) ''اور (یہ پیغمبر) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے''۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ موردِ وحی ہونے کے باوجود رسول اکرم ﷺ کو اپنے ساتھیوں سے اہم امور میں مشورہ لینے کا حکم بے مقصد نہیں ہے۔ اس سے صحابہ کرامؓ کی تربیت بھی مقصود تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد بھی اس پر کاربند رہیں۔ دلجوئی بھی مقصود تھی خصوصاً جبکہ ان کے

کئی ایک مشوروں کو قبول کر کے انہیں بروئے کار بھی لایا گیا۔

(ج) منافقین رسول اکرم ﷺ سے دور دور رہنا پسند کرتے تھے:

منافقین کو ہرگز یہ شوق نہ تھا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے اردگرد رہ کر آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔ ان کا آپ کی مجلس میں آنا نیک نیتی سے نہیں بلکہ فاسد اغراض پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے خوف سے اپنی جانوں اور اموال کے تحفظ کے لئے، مسلمانوں کی جاسوسی اور ان سے معلومات حاصل کرنے کے لئے۔ موقع بموقع تفریق بین المومنین کی مکروہ سازشوں وغیرہ مقاصد کے لئے رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب سے کسی حد تک روابط رکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے ورنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جم کر بیٹھنا اور دینی کاموں خصوصاً جہاد وقتال فی سبیل اللہ، انفاق فی سبیل اللہ میں شریک ہونا ان کے لئے سوہانِ روح تھا۔ درج ذیل بعض قرآنی آیات پر غور کیجئے: وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ط هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۴۲) ''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ (منافقین) ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر (چپکے سے مجلس سے) اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دئے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے''۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ط قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (۴۳) ''(اے مسلمانو!) تم پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرو جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ بے شک اللہ تم میں (موجود) ان (منافقوں) کو جانتا ہے جو چپکے سے تمہارے درمیان سے کھسک جاتے ہیں۔''

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۴) ''بے شک منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں دھوکہ (کی سزا) دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔''

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ O وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ O لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ O (۴۵) ''تجھ سے (غزوہ تبوک

میں شامل نہ ہونے کے لئے) اجازت وہی مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین نہیں رکھتے اور جن کے دلوں میں شک ہے اور اپنے اسی شک میں وہ متردد ہیں۔ اگر ان لوگوں کا جہاد کے لئے نکلنے کا (پرخلوص) ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لئے تیاری بھی کرتے لیکن اللہ نے ان کا (جہاد کے لئے) اٹھنا ناپسند کیا تو انہیں ہلنے جلنے ہی نہ دیا اور (ان سے) کہا گیا کہ تم بھی بیٹھے رہنے والے (اپنے دیگر) ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اگر یہ نکلتے بھی تو سوائے شرارت کے تمہارے کاموں میں وہ اور کوئی اضافہ نہ کرتے، تمہارے اندر فساد ڈالنے کی غرض سے دوڑے دوڑے پھرتے اور تمہارے اندر (کفار کے لئے جاسوسی کی خاطر اور) ان (کافروں) کے لئے تم سے باتیں سننے کی خاطر بھی یہ لوگ موجود ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ط وَمَاهُمْ مِنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ O لو يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ O (۴۶)''اور یہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں لیکن وہ (تم سے) ڈرنے والے لوگ ہیں۔ اگر انہیں کوئی بچاؤ کی جگہ، کوئی غار یا کوئی گھسنے کی جگہ مل جائے تو وہ ادھر رسیاں تڑاتے ہوئے بھاگ جائیں۔''

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا O اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ط اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ط وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا O يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ج وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِى الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْبَآئِكُمْ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْا اِلَّا قَلِيْلًا O (۴۷)''بے شک اللہ تم میں سے (غزوہ احزاب میں شامل ہونے سے) روکنے والوں کو اور اپنے بھائیوں سے یہ کہنے والوں کو کہ ادھر ہمارے پاس آ جاؤ، خوب جانتا ہے اور یہ (منافقین) جنگ میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ تمہارے بارے میں (جان و مال دینے میں) بخل سے کام لیتے ہیں تو جب خطرہ لاحق ہو تو انہیں دیکھے گا کہ وہ تیری طرف اس طرح دیکھ رہے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں یوں گھومتی ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو اور جب (جنگ کا) خطرہ ٹل جائے تو یہ تم سے تیز تیز باتیں کرتے ہوئے مال (غنیمت) کے لالچ میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں تو اللہ نے ان کے (ظاہری نیک) اعمال برباد کر دیئے اور اللہ پر یہ کام آسان ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ (غزوہ احزاب میں کفار کے) گروہ ابھی نہیں گئے اور اگر (کفار کی یہ)

جماعتیں (خدانخواستہ مدینہ) کے اندر آجائیں تو وہ چاہیں گے کہ کاش دیہاتی گنواروں کے ہمراہ دیہاتوں میں رہ رہے ہوتے اور وہیں سے تمہاری خبریں معلوم کرلیا کرتے۔ اگر یہ لوگ تمہارے اندر ہوتے بھی تو بھی لڑائی میں بہت کم حصہ لیتے''۔

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُهُمْ ط وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ کَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ O وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ O (۴۸)۔ ''اور جب تو ان (منافقوں) کو دیکھے تو ان کے (موٹے تازے) جسم تجھے اچھے لگیں گے اور اگر یہ کوئی بات کریں (اور) تو ان کی بات سنے گا تو (یہ دکھائی دے گا) گویا وہ (ایک جگہ) کھڑی ہوئی لکڑیاں ہیں (کہ بظاہر بڑے شائستہ نظر آتے ہیں) ہر چیخ (تیز آواز) کے متعلق ان (منافقوں) کو یہ گمان ہوتا ہے کہ بس یہ انہی کے خلاف ہے۔ (اے پیغمبر!) تو ان لوگوں (کی چالاکیوں اور مکاریوں) سے بچ کر رہ، اللہ انہیں تباہ کرے یہ کہاں پھرے جاتے ہیں؟ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ کے رسول کے پاس) آجاؤ اللہ کا رسول تمہارے لئے استغفار کرے تو وہ اپنے سروں کو جھٹکتے ہیں اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ (اپنے ساتھیوں کو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے) روکتے ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں (کہ خود بھی رسول اکرم ﷺ کے پاس نہیں آتے)''

یَقُوْلُوْنَ لَاتُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا (۴۹) ''یہ (منافق) کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے نزدیک (رہتے) ہیں ان پر مال خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ آپ سے ہٹ جائیں (تو رسول اکرم ﷺ کی مجلس میں اکثر و بیشتر حاضر باش رہنے کی سعادت صرف صحابہ کرامؓ کو حاصل تھی، منافق پرے پرے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان بھی رسول اکرم ﷺ کے اردگرد سے منتشر ہو جائیں)''

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ م بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَیَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَهُمْ (۵۰) ''منافق مرد اور منافق عورتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہیں، وہ برے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور نیک کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (بوجہ بخل) سمیٹے رہتے ہیں''۔

اس آیت سے منافقین کی نیکیوں سے نفرت، برائیوں سے محبت اور مال خرچ کرنے میں بخل اور کنجوسی بخوبی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس صحابہ کرامؓ عموماً اور خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیقؓ،

حضرت عمر فاروقؓ، اور حضرت عثمانؓ خصوصاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پابند تھے۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے تھے۔ مثلاً غزوہ تبوک میں خلفائے ثلاثہ کی مالی خدمات مسلم ہیں۔ امامیہ عالم علامہ ابن میثم بحرانی شرح نہج البلاغۃ میں اس شبہہ کے جواب میں کہ سیدنا حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ سے تو جنگ کی لیکن خلفائے ثلاثہ سے جنگ نہیں کی تحریر فرماتے ہیں: **ان الفرق بین الخلفاء الثلثة وبین معاویة فی اقامة حدود الله والعمل بمقتضیٰ اوامره ونواهیه ظاهر** (۵۱) ''یعنی خلفائے ثلٰثہ اور معاویہؓ کے درمیان اللہ کے حدوں کے قائم رکھنے اور اوامر ونواھی کے سلسلے میں شریعت کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے میں جو فرق تھا، وہ ظاہر ہے۔''

پس امامیہ عالم کے مذکورہ اعتراف کی روشنی میں یہ ثابت ہوگیا کہ خلفائے ثلاثہ ہرگز منافق نہ تھے کیونکہ قرآنی شہادت کے مطابق منافقین تو شریعت کے اوامر ونواہی کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔

منافقین کے متعلق مذکورہ بالا آیات پر غور کرنے سے اس شبہ کا قلع قمع ہوجاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے اصحاب کے لئے یہ اہتمام فرمایا کہ وہ آپ کے اردگرد ہی رہیں اور آپ سے فیضیاب ہوتے رہیں تو اس نے منافقین کے لئے یہ اہتمام کیوں نہ فرمایا کہ وہ آپ کے اردگرد سے منتشر ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ بزدل، بخیل، دینی فرائض سے پہلوتہی کرنے والے یہ بدبخت منافقین تو خود ہی رسول اکرم ﷺ سے دور رہنا پسند کرتے تھے تو الگ سے کسی ایسے خاص اہتمام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان کا آپ کے پاس کبھی کبھی آنا فاسد اغراض کی بنا پر تھا نہ کہ انہیں آپ سے کوئی عقیدت ومحبت تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ کفار اور منافقین کا تعلق رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں سے بالکل ہی منقطع فرمادیتا تو بعثت رسول کے مقاصد پورے نہ ہوتے کیونکہ اللہ کا پیغمبر مومنین مخلصین کے لئے بشیر (خوشخبری سنانے والا) اور منکرین و معاندین کفار ومنافقین کے لئے نذیر (اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا) ہوتا ہے نیز مخالفین ومعاندین پر اللہ تعالیٰ رسولوں کے ذریعے اپنی حجت پوری فرماتا ہے کہ قیامت کے دن وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس اللہ کا کوئی پیغمبر آیا ہی نہیں تھا۔ نیز کفار و مفافقین کو دین کی تبلیغ اور ان کی طرف سے انکار ومخالفت، عناد وعداوت، قتال ومخاصمت، ایذ ارسانی و بدزبانی پر صبر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور مومنین مخلصین کو بے حد وحساب اجر وثواب حاصل ہوتا ہے اور ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ نیز مثل مشہور ہے الاشیاء تُعرف باضدادھا کہ چیزوں کی اصل پہچان ان کی اضداد سے ہوتی ہے۔ تو جب ایمان و اخلاص کا کفر ونفاق سے، توحید کا شرک سے، سنت کا بدعت سے تقابل ہوتا ہے تو ایمان و اخلاص اور توحید و سنت کی اہمیت و برکت اور قدر و قیمت بمقابلہ کفر ونفاق، بدعت وضلال، شقاوت و

شناعت، حرمان ونحوست بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔لہٰذا یہ شبہہ بھی باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کا کیوں اہتمام نہ فرمایا کہ کفار ومنافقین کو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اردگرد ہونے کے مواقع کبھی بھی حاصل نہ ہوا کرتے خواہ وہ خوشی سے حاضر ہوں یا ناخوشی اور ناگواری سے، کسی طرح کا کبھی بھی کوئی رابطہ نہ ہوا کرتا یا اس امر کا اہتمام کیوں نہ فرمایا کہ خود رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحابؓ کو ان کفار ومنافقین سے کسی طرح کا کبھی بھی سابقہ نہ پڑتا۔

(د) رسول اکرم ﷺ کے دور کے مومنین مخلصین بمقابلہ کفار ومنافقین (تلخیصِ مباحث) :

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے ایمان کو دوسروں کے لئے معیاری ٹھہرایا ہے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۵۲) ''تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم (اصحابِ رسول) ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا گئے اور اگر یہ منہ پھیریں تو وہ محض (بیجا اور ناحق) مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

پس اس طرح کی نام نہاد دقیق مگر رکیک تحقیق میں لگنا پرلے درجے کی غیر دانشمندانہ جسارت ہے کہ فلاں صحابی کی ہجرت، فلاں کا فلاں جہاد، فلاں کا فلاں انفاق وقتال فی سبیل اللہ وغیرہ خلوص پر مبنی نہ تھا۔ جیسا کہ مقالہ ہذا کے ابتدائی حصے میں واضح کیا جاچکا ہے سب صحابہ کرامؓ حسنِ عاقبت کے اعتبار سے علوم العاقبہ اور دوسرے سب لوگ مجہول العاقبہ ہیں۔قریش مکہ حالتِ کفر میں صحابہ کرامؓ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ (معاذ اللہ) گمراہ لوگ ہیں اللہ تعالیٰ نے ان اصحابِ رسول کی حمایت میں فرمایا: وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (۵۳) ''اور حال یہ ہے کہ ان (معترضین) کو ان (صحابہ کرامؓ) پر نگران مقرر نہیں کیا گیا ہے''۔

یعنی ان لوگوں کو صحابہ کرامؓ کے مفروضہ یا حقیقی عیوب تلاش کرنے کی بجائے اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہئے۔اکثر وبیشتر ظنی بلکہ جھوٹی روایات پر مبنی مخالفین کا کوئی دعویٰ بالفرض صحیح بھی ہو تو بھی معلوم العاقبۃ کا ہونے کی بنا پر صحابہ کرامؓ کا مقام ومرتبہ ہرگز مجروح نہیں ہوتا۔کسی صحابی سے کسی خاص موقع پر کوئی کوتاہی ہوئی بھی ہو تو بعد کے اعمال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیے وتطہیر اور تعلیم وتربیت سے ان کی اصلاح ہوگئی اور انکی سابقہ کوتاہیاں اور لغزشیں معاف ہوگئیں ورنہ قرآنِ کریم میں جا بجا انہیں مغفور ومرحوم قرار نہ دیا جاتا اور کامیاب وکامران شمار نہ کیا جاتا رسول اکرم ﷺ کی مشفقانہ اور حکیمانہ تعلیم وتربیت اور تزکیہ وتطہیر سے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل وکرم سے بہت سے منافقین تک کی اصلاح

ہوگئی اور ان کی سابقہ لغزشیں معاف کر دی گئیں مثلاً سورۂ توبہ میں غزوۂ تبوک کے زمانے کے منافقین کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ط اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۵۴) ''(اے منافقو!) تم (جھوٹے) بہانے نہ کرو بے شک تم نے اپنا ایمان (ظاہر کرنے) کے بعد کفر کیا ہے (اور اس کفر کو چھپا کر نفاق کی راہ اپنائی ہے) اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں گے (کہ انہیں توبہ اور دوبارہ اسلام قبول کرنے کی توفیق مل جائے) تو دوسرے گروہ کو ہم عذاب دیں گے اس لئے کہ وہ بلاشبہ مجرم ہیں۔''

سورۂ احزاب میں ہے: لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۵) ''تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کا صلہ دے اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا ان پر رحمت سے توجہ کرے (کہ وہ تائب ہو کر مخلص ہو جائیں) بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے'' ایسے ہی منافقین کی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہو تو کچھ بعید نہیں۔

سورۂ فتح کے دوسرے رکوع میں غزوۂ حدیبیہ کے موقع کے بدو منافقین کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۶) ''اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت ہے وہ جسے چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا''۔

سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے بدو منافقین کے متعلق ارشاد فرمایا ''کہ تم (یوں نہ کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں) بلکہ یوں کہو کہ ہم (ظاہری طور پر) مسلمان ہو گئے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی فرمایا: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۷) ''اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی (خلوصِ قلب سے) اطاعت کرو تو وہ تمہارے اعمال (کے اجر) میں کوئی کمی نہیں کرے گا (اور تمہارے تمام گناہوں کو بخش دے گا) بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔''

تو یہاں آیت میں ''لم'' کی بجائے ''لما'' لاکر یہ بتایا گیا ہے کہ گو ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا لیکن بالآخر داخل ہو جائے گا اور ان تمام آیات میں معافی کے تذکرے کے ساتھ صفات''

غفور رحیم'' لاکر ان منافقین کے تائب ہونے اور ایمان واعمال صالحہ کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کی بنا پر مغفور ومرحوم ہونے کی طرف واضح اشارہ کر دیا گیا ہے۔ جب بعض منافقین تک رحمۃ اللعلمین شفیع المذنبین رسول اکرم ﷺ کے طفیل بالآخر مومن کامل اور مغفور ومرحوم ہوئے تو خطا کار صحابہ کرامؓ ان منافقین سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ٹھہرے مثلاً غزوہ تبوک آخری غزوہ ہے اس میں غفلت وکوتاہی کی وجہ سے شریک نہ ہونے والے صحابہ کرامؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۸) ''اور کچھ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تو قریب ہے کہ اللہ ان پر رحمت سے توجہ فرمائے بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔

صحابہ کرامؓ معصوم عن الخطاء نہ تھے اس لئے قیامت تک کے مخالفین اور معاندین کو ان حضرات کے خلاف انگشت نمائی کا موقع مل سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا راستہ یوں بند کر دیا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۵۹) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین وانصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل (ان کی لغزشوں کی وجہ سے) پھر جانے کو تھے، مشکل کی گھڑی میں وہ پیغمبر کے ساتھ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت سے توجہ فرمائی بے شک وہ ان (صحابہ کرامؓ مہاجرین وانصار) پر نہایت شفقت کرنے والا بے حد مہربان ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے گواہی دے دی کہ وہ اصحاب رسول سے رحمت وشفقت کا سلوک فرمائے گا، عدل کا نہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو جائے اس کے سب گناہ اور لغزشیں معاف ہیں اس کی رحمت کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے چنانچہ ارشاد ہے: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۶۰) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو اس ڈر سے کہ یہ خزانے خرچ نہ ہو جائیں (از راہ بخل) انہیں روکے رکھتے (اور خرچ نہ کرتے) بے شک انسان بہت تنگ دل ہے۔''

الغرض جب بعض منافقین تک کی اصلاح ہوگئی تو گناہ گار وخطا کار صحابہ کرامؓ بھلا کیوں محروم رہتے؟ البتہ ایسے شریر ومعاند منافقین جو اصلاح وتربیت کے ہرگز ہرگز طالب ہی نہیں تھے اور جن کی قسمت میں ہدایت نہیں تھی تو ایسے منافقین کا اللہ تعالیٰ نے مخلص مومنین سے ایسا کھلا، ایسا واضح اور ایسا روشن امتیاز فرما دیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں کسی قیل وقال اور چوں وچرا کی معمولی گنجائش بھی نہ چھوڑی مثلاً

مقالہ ہذا کے مباحث سے آپ معلوم کر چکے ہیں کہ :

(۱) جن لوگوں نے قبلہ اول بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں اور جن سے رسول اکرم ﷺ نے مضبوط معاشرتی روابط عمر بھر استوار رکھے وہ ہرگز منافق و مرتد نہیں ہو سکتے کہ ان کے ایمان کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا اور ان پر اپنے مشفق اور مہربان ہونے کا بھی اعلان فرمایا۔ جن پر اللہ تعالیٰ مہربان ہو وہ ہرگز جہنم میں نہیں جا سکتے پس ان کے پہلے زمانے کے کسی عمل مثلاً ہجرت وغیرہ میں بالفرض کوئی خامی یا کوتاہی رہ گئی ہو تو وہ یقیناً معاف ہے۔ اور تو اور نماز پڑھنے سے ہی گناہ اور لغزشیں معاف ہو جاتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۶۱) ''تو دن کے دونوں اطراف اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کر (اس میں پانچوں نمازیں آ گئیں) بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔''

(۲) غزوۂ بدر میں کوئی منافق ہرگز شریک تھا ہی نہیں۔ اس غزوۂ میں شریک مومنین کی اللہ تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے تھے اور غزوہ کے دوران ان کے لئے اپنی خاص الخاص نصرت مثلاً ملائکہ کے ذریعے مدد کا ذکر فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کسی کی مدح نہیں کرتا جو فی الحال منافق ہو یا مستقبل میں مرتد ہونے والا ہو نہ ہی اللہ ان کی مدح فرماتا ہے جو جہنم میں جانے والے ہوں بس شرکائے بدر صحابہ کرامؓ مغفور و مرحوم ہیں۔

ثعلبہ بن حاطب اور معتب بن قشیر اگر واقعی غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے تو وہ ہرگز ہرگز منافق نہیں ہو سکتے ان کے منافق ہونے کے متعلق تمام تاریخی اور تفسیری روایات مردود سمجھی جائیں گی چنانچہ ابن کثیر کو البدایۃ والنہایۃ میں ثعلبہ بن حاطب، حارث بن حاطب اور معتب بن قشیر کے متعلق لکھنا پڑا: **ولیسوا من المنافقین فیما ذکر لی من اثق به من اهل العلم** (۲/۶۱) ''اور وہ منافقوں میں نہیں ہیں اور یہ حقیقت بھی ان باتوں میں شامل ہے جو مجھے معتمد اہل علم نے بتائی ہیں''۔ اگر مذکورہ لوگ غزوہ بدر میں شامل نہیں تھے تو ممکن ہیں کہ ان کے متعلق اس طرح کے روایات درست ہوں۔ اسمائے بدریین بھی سب کے سب متفق علیہ نہیں بلکہ ان ناموں میں اختلاف ہے اور بسا اوقات بیٹے اور باپ دونوں کے نام بلکہ کئی اشخاص میں مشترک بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی طرح احادیث میں بھی صاف بشارت اہل بدر کی ہو چکی کہ وہ سب کے سب مغفور ہیں۔

(۳) غزوہ احد میں شریک جو صحابہ کرامؓ مقتول ہو کر شہید نہیں ہوئے تھے اور پیچھے دنیا میں رہ گئے تھے ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے شہدائے احد کو جنت میں یہ بشارت دی کہ ان پر بھی (آخرت

میں) کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے پس یہ لوگ منافق نہ تھے اور نہ ہی مرتد ہونے والے تھے بلکہ سب کے سب مغفور ومرحوم ہوئے اگر ان سے کسی طرح کی کوئی لغزش زمانۂ ماضی میں سرزد بھی ہوئی ہوتو، یقیناً معاف ہوگئی۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین جو نفاق میں پختہ تھے، اس غزوہ میں سرے سے شریک ہی نہیں ہوئے۔ اس غزوہ میں شریک جو لوگ آزمائش اور ابتلا کی شدت میں وساوس کا شکار ہونے لگے تھے، بالآخر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھٹکنے سے بچ گئے، نفاق میں پختہ بعض لوگوں کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرما دیا۔ جن کی موت کفر ونفاق پر ہوئی، جبکہ اکثر منافقین کا نفاق غزوہ احد، غزوہ خندق، غزوۂ حدیبیہ اور غزوۂ تبوک جیسی آزمائشوں میں از خود کھل گیا، لہذا مخلص مومنین اور دغاباز منافقین میں مکمل امتیاز ہوگیا۔ اور دیگر مختلف مواقع پر بھی مختلف طریقوں سے ہوتا رہا جیسا کہ آئندہ سطور میں نمبر شمار، ۱۳، ۱۴ سے بھی واضح ہو رہا ہے کتب سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین تعداد میں بہت کم تھے جو بالآخر ذلیل وخوار ہوئے سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ عزت اللہ، اس کے رسول اور مومنین (صحابہ کرامؓ) کے لئے ہی ہے لیکن منافق علم نہیں رکھتے۔ تاہم جن منافقین کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کی توفیق بخشی اور ان پر اپنی رحمت سے توجہ فرمائی، عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ (ستار العیوب) نے ان کے نفاق کو ظاہر نہ ہونے دیا ہو۔ خلفائے راشدینؓ کو عزت حاصل ہوئی کہ امت کا بہت بڑا طبقہ (سواد اعظم) دل وجان سے ان کے مقام ومرتبے اور ان کی دینی خدمات کا معترف ہے لہذا وہ اور ان کے ساتھی ہرگز منافق نہ تھے۔

(۴) غزوۂ احد میں جن لوگوں نے میدان چھوڑا تھا جب اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان فرمایا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ مومنین پر فضل فرمانے والا ہے پس یہ مومنین تھے، منافق نہ تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ہوا کہ آپ انہیں معاف کر دیں، انہیں مشوروں میں شریک کریں اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کریں۔ رسول اکرم ﷺ کو کفار ومنافقین کے لئے استغفار کی اجازت نہ تھی اور ان سے مشورے لے کر ان پر عمل کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ ہی آپ کو کسی اثم و کفور (گناہ گار اور ناشکرے) کی بات ماننے کی اجازت تھی پس یہ حضرات منافق بھی نہیں اور نہ ہی گناہ گار اور ناشکرے تھے بلکہ متقی وپرہیزگار تھے۔ پس جب رسول اکرم ﷺ کے استغفار سے غزوۂ احد میں میدانِ جنگ چھوڑنے کا گناہ کبیرہ معاف ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی دو مرتبہ ان کی معافی کا اعلان فرمایا تو اس سے پہلے کے کسی عمل مثلاً ہجرت وغیرہ میں ان سے بالفرض کوئی کوتاہی ہوئی بھی ہوتو وہ بھی لازماً معاف ہوگئی۔

(۵) سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے کہ اس نے تمہیں وہاں سے بچالیا پس جو جہنم سے بچ گیا تو اُخروی نعمت اور اس کی بشارت زوال پذیر نہیں ہوسکتی اس لئے وہ منافق ومرتد نہیں ہوسکتا بلکہ یقیناً مغفور ومرحوم ہے۔

(۶) سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان میں شریک صحابہ کرامؓ کو اپنی رضامندی کی بشارت دی اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دلوں کا حال معلوم ہے اسی لئے اس نے ان پر سکینہ اور اطمینان نازل کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فتوحات وغنائم اور اسلام کے غلبے کی پے در پے بشارتیں بھی دیں پس یہ حضرات منافق نہ تھے اور نہ مرتد ہونے والے تھے۔ قرآن مجید میں ہے: فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۱/۶۲) ''تو بے شک اللہ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں سے اللہ راضی ہوجائے وہ ہرگز فاسق نہیں ہوا کرتے پس یہ حضرات بھی فاسق نہیں تھے اور معصوم نہ ہونے کی وجہ سے کسی سے کوئی لغزش ہوئی بھی ہو تو وہ یقیناً معاف ہوگئی اور وہ سب کے سب یقیناً پاک وصاف ہوکر مغفور ومرحوم ہوئے۔ سرخ اونٹ والا جد بن قیس نام کا منافق بموجب حدیث نبوی اس بیعت رضوان میں پہلے ہی سے شامل نہ تھا باقی بموجب حدیث نبوی بھی سب کے سب جہنم سے آزاد ہیں۔

(۷) بیعت رضوان میں شریک صحابہ کرامؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ تمہیں صراط مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے جیسا کہ اسی سورت کی ابتدائی آیات میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ تجھے صراط مستقیم پر چلائے رکھنا چاہتا ہے پس یہ حضرات صراط مستقیم پر دائم وقائم رہے نہ وہ منافق تھے اور نہ ہی وہ مرتد ہوئے۔

(۸) فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے قریش مکہ کو اللہ تعالیٰ نے مؤلفۃ القلوب قرار دیا اور غزوۂ حنین اور غزوۂ اوطاس کے اموال غنیمت انہی کو عطا فرمائے گئے۔ مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو کچھ بھی نہ دیا گیا اگر یہ منافق ہوتے یا نفاق پر قائم رہنے والے ہوتے یا بعد میں مرتد ہونے والے ہوتے تو ہرگز ہرگز اس خصوصی حسنِ سلوک کے مستحق نہ ہوتے کیونکہ کفار ومنافقین کے گھر کو دارالامان قرار دینے اور مسلمانوں کو نظر انداز کرکے ان کے گھروں کو اموال غنیمت سے بھر دینے کا اللہ تعالیٰ نے ہرگز کبھی کوئی حکم نہیں دیا بلکہ کفار ومنافقین کے خلاف جہاد کرنے اور ان پر سختی کرنے کا خاص نبی کریم ﷺ ہی کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ حکم دیا۔

(۹) اللہ تعالیٰ نے انصار ومہاجرین کو یہ بشارت دی کہ جن قریش مکہ سے تمہاری دشمنی ہے اللہ

اسے محبت سے بدل دے گا کیونکہ وہ (دلوں کا حال بدلنے اور قبول اسلام کی توفیق دینے پر) قادر ہے اور وہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ پس فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے یہ حضرات مغفور ومرحوم ہیں یہ منافق نہ تھے اور نہ ہی مرتد ہونے والے تھے۔

(۱۰) سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کی بے حد مدح فرمائی، ان کی اسلامی خدمات شمار کیں اور آنے والے مسلمانوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ جہاں اپنے لئے دعائے مغفرت کریں گے، ان مہاجرین وانصار کے لئے بھی استغفار کیا کریں گے (کیونکہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں) اور یہ دعا بھی کیا کریں گے کہ اے اللہ! ان سابق الایمان لوگوں کی مغفرت فرما اور ہمارے دلوں میں ان کے خلاف کوئی کینہ نہ رکھ۔ پس صحابہ کرامؓ نہ منافق تھے اور نہ ہی وہ مرتد ہونے والے تھے بلکہ ان سے کینہ رکھنے والے ہی باطل پر ہیں، رسول اکرم ﷺ کو بھی ان کے لئے استغفار کا حکم تھا۔ ملائکہ بھی ان کے لئے دعائے رحمت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں خاص الخاص رحمت سے نوازا جس کا مثلاً تذکرہ اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی فرمایا پس یہ حضرات منافق ومرتد نہیں بلکہ مغفور ومرحوم ہیں۔

(۱۱) سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کو پکے مومن قرار دیا ہے اور ان کے لئے مغفرت اور (جنت میں) عمدہ رزق کا وعدہ فرمایا ہے۔ سورۂ توبہ اور سورۂ محمد میں صحابہ کرامؓ سے کہا گیا ہے کہ اگر تم اطاعت رسول کے مطلوبہ معیار پر پورے نہ اترے تو اللہ تمہاری بجائے کوئی اور قوم لے آئے گا پھر وہ تمہاری طرح کے نہ ہوں گے۔ بعد میں اللہ کوئی اور قوم ان کے بجائے نہیں لایا پس، سب کے سب صحابہ کرامؓ ایمان وعمل کے اعتبار سے مطلوبہ معیار پر قائم تھے ورنہ اللہ اپنا قول پورا کرتا اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لاتا پس وہ منافق ومرتد نہ تھے بلکہ مغفور ومرحوم تھے۔

(۱۲) سورۂ بقرہ میں ہے کہ جو منافقین صحابہ کرامؓ کو بے وقوف قرار دیتے ہیں تو یہ منافقین خود ہی بے وقوف ہیں نیز اسی سورت میں ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم اصحابِ رسول ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پر آجائیں گے پس صحابہؓ کا ایمان معیاری ایمان ہے وہ نہ تو منافق تھے اور نہ ہی مرتد ہونے والے تھے پس وہ مرحوم ومغفور بھی ہیں ورنہ ان کے ایمان کو معیاری قرار دینا بے معنی ہوگا۔

(۱۳) قرآن کریم میں جا بجا اسلام کے غلبے اور کفر ونفاق کے زوال اور رسوائی کی خبریں دی گئی ہیں سورۂ حج کی آیت تمکین اور سورۂ نور کی آیت استخلاف میں خلفائے راشدینؓ کے برحق ہونے پر صاف صاف دلائل موجود ہیں، پس یہ حضرات منافق ومرتد نہ تھے۔ ورنہ مرتد ہونے والوں کی مغلوبیت

اور رسوائی کی سورۂ مائدہ کی آیت قتالِ مرتدین میں اور منافقین کی مغلوبیت اور رسوائی کی متعدد قرآنی سورتوں مثلاً سورۂ توبہ وغیرہ میں بڑی واضح خبریں دی گئی ہیں یہ خبریں ہرگز ان صحابہ کرامؓ پر چسپاں نہیں ہوتیں جنہوں نے اسلام کو غالب کیا اور مرتدین ومخالفین زکوٰۃ کے علاوہ روم وایران کے کفار کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ آیت قتال مرتدین میں اللہ تعالیٰ نے مرتدین کے خلاف جنگ کرنے والوں کو اپنا محبوب قرار دیا ہے کہ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے پس ان کے خلاف تمام مطاعن یا تو قطعاً جھوٹے ہیں یا بعض واقعات کو غلط رنگ دیا گیا ہے اور غلط نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

(۱۴) کفار ومنافقین کے خلاف جہاد اور ان پر سختی کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم میں دیا۔ رسول اکرم ﷺ کے دور کے کفار ومنافقین کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت میں رسوائی ہوگی۔ دنیا میں کوئی ان کا حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔ منافقین کو آخرت کے علاوہ بھی دو مرتبہ عذاب اٹھانا ہوگا۔ ان کی خلافِ اسلام سازشیں خفیہ نہ رہیں گی۔ انہوں نے لرزہ خیز جھوٹی افواہیں اور سازشیں بند نہ کیں تو انہیں مدینہ سے نکلنا پڑے گا۔ انہیں جوارِ رسول سے محروم ہونا پڑے گا اور یہ جہاں بھی جائیں گے، رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ماخوذ ومقتول اور ذلیل ورسوا ہوں گے۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ پر یہ علامات ہرگز چسپاں نہیں ہوتیں پس وہ ہرگز منافق نہ تھے۔

(۱۵) سورۂ حجرات میں ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو تم ان میں صلح کرا دیا کرو کہ مسلمان باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں سورۂ حجر اور سورۂ اعراف میں ہے کہ قیامت کے دن جنتیوں کے دلوں کی باہمی رنجش کو اللہ تعالیٰ دور فرما دے گا اور ان میں باہم صلح کرا دے گا پس مشاجراتِ صحابہؓ کی آڑ میں طعن وتشنیع کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں کیونکہ سب صحابہ کرامؓ کے مغفور ومرحوم ہونے کے مضمون کو قرآن کریم میں متعدد مواقع پر متعدد انداز میں اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے مثلاً سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ بروز قیامت اپنے نبی اور اس نبی کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ سورۂ حدید میں ہے کہ فتح (مکہ) سے پہلے جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور اللہ کی راہ میں قتال کیا ان کا مرتبہ ان لوگوں سے بلند ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور قتال کیا ویسے اللہ نے ہر ایک سے ہی بھلائی کا وعدہ کر لیا ہے۔ پس سب صحابہ مغفور ومرحوم ہیں یعنی مہاجرین مکہ، انصارِ مدینہ اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے قریش مکہ جو مولفۃ القلوب کہلائے سب کے سب مغفور ومرحوم ہیں جنہوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کیا اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کیا پس یہ حضرات منافق ومرتد نہ تھے۔

(۱۶) سیدنا حضرت علیؓ رسول اکرم ﷺ کے اہل بیت میں شامل ہیں اور آپ کے داماد

ہیں۔ پیغمبر کا ہر کام وحی سے ہوتا ہے اگر حضرت علیؓ بقول خوارج (معاذ اللہ) کافر ومرتد ہونے والے ہوتے تو رسول اکرم ﷺ سے ان کے یہ روابط ہرگز نہ ہوتے دیگر خلفائے راشدینؓ کے بھی رسول اکرم ﷺ سے صہری روابط ہیں۔

(۱۷) مذکورہ امور کے علاوہ حضرت علیؓ نے اپنے پیشرو خلفائے راشدینؓ سے مثالی تعاون فرمایا ان سے نہایت قریبی روابط رکھے۔ اپنے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کی بیوہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں ہونا پسند فرمایا۔ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر جب حضرت عمر فاروقؓ دارالخلافہ مدینہ منورہ سے باہر گئے تو حضرت علیؓ نے ان کا نائب بننا قبول فرمایا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تقیہ کا عذر اس لئے نہیں چل سکتا کہ آپ بالاتفاق اسد اللہ الغالب ہیں نیز ہمارے امامیہ بھائی تو انہیں ''مشکل کشا'' مانتے ہیں تو وہ ہرگز ہرگز مجبور ومغلوب نہیں تھے اور نہ ہی وہ خوف ودہشت کا شکار ہو سکتے تھے۔

(۱۸) سیدنا حضرت علیؓ ایمان واعمال صالحہ کی دولت سے یقیناً ثروت مند تھے اس لئے سورۂ نور کی آیت استخلاف کے وہ بھی مصداق تھے پس بموجب آیت وہ کفار کے مقابلے میں مضبوط حکومت کے مالک تھے اور انہیں کوئی خوف لاحق نہ تھا انہوں نے اپنے پیشرو خلفاء کے بیشتر کاموں کو بحال رکھا پس وہ سب کے سب مخلص مومن تھے۔ منافق ومرتد نہ تھے۔

(۱۹) آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے جس خلافت کا وعدہ فرمایا ہے جید امامیہ علماء مثلاً علامہ محمد حسین طباطبائی کے نزدیک بھی یہ خلفائے راشدینؓ کی خلافت ہے، پس اگر حضرت علیؓ سے خلافت بلافصل کا وعدہ ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یقیناً یہ وعدہ پورا فرماتا درمیان میں اصحاب ثلٰثہ نہیں آسکتے تھے پس سب ہی حق پر ہیں کوئی بھی منافق یا مرتد نہ تھا نیز خلفائے راشدینؓ کی خلافت کو صحیح نہ ماننے سے لاتعداد بے حد مشکل بلکہ لاینحل اعتراضات قائم ہوتے ہیں جیسا کہ مقالہ ہذا کی دوسری قسط میں واضح کیا جاچکا ہے پس سب ہی حق پر ہیں کوئی بھی منافق یا مرتد نہ تھا۔

(۳) شہدائے غزوۂ احد:

ان شہدا سے متعلق سورۂ ال عمران کی جن آیات کا حوالہ دیا گیا تھا، ان کا شانِ نزول گو خاص شہدائے احد ہیں لیکن یہ مسلمہ اصول ہے کہ اعتبار عموم کا ہوتا ہے خاص شانِ نزول ہی کا نہیں (العبرۃ للعموم لا لخصوص المورد) پس ان آیات کا مدلول ومفہوم صرف شہدائے احد ہی پر نہیں بلکہ قیامت تک کے مستقبل کے شہدا پر بھی چسپاں ہوگا۔ جب بشارت کسی خاص فرد، گروہ، جماعت یا قوم کے لئے ہو تو لازماً یہی

سمجھا جائے گا کہ ان لوگوں نے تمام متعلقہ شرائط پوری کی ہیں یا وہ ان شرائط پر ہمیشہ قائم رہیں گے ورنہ بشارت کے لئے انہیں مخصوص کرنا عبث ہوتا۔ جب بشارت کسی خاص فرد یا گروہ کے لئے مخصوص نہ ہو بلکہ عام ہو تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بشارت کا اطلاق کن لوگوں پر ہوگا، متعلقہ شرائط بھی ملحوظ رکھی جائیں گی خواہ بشارت کے مضمون میں ان کا تذکرہ نہ بھی ہو کیونکہ کسی شے کے کسی موقع پر مذکور نہ ہونے سے اس کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی چونکہ سورۂ آل عمران کی شہداء سے متعلق آیات کا تعلق غزوہ احد کے شہداء کے علاوہ دیگر شہدا سے بھی ہے لہٰذا جن مفسرین نے آیات کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ ان شہدا کو ان کے لواحقین کے متعلق یہ خوشخبری دی جارہی ہے کہ اگر دین اور قتال فی سبیل اللہ پر قائم رہتے ہوئے وہ بھی شہید ہو کر ان سابق شہدا سے جا ملیں، تو ان پر بھی کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے، تو ان مفسرین کا اس طرح لکھنا ان آیات کے مدلول و مفہوم کو عام شہدا پر بھی لاگو کرنے کی غرض سے ہے۔ غزوۂ احد میں شریک صحابہ کرامؓ کے مومن ہونے اور قتال فی سبیل اللہ میں خلوصِ نیت سے شریک ہونے کی شرائط پہلے ہی سے ان میں موجود تھیں اور ہمیشہ موجود رہیں لہٰذا شہدائے احد اور ان کے لواحقین احباب واقارب کے لئے یہ بشارات غیر مشروط ہیں ورنہ بشارت کے لئے ان کی تخصیص (معاذ اللہ) بے معنیٰ، بے مقصد اور عبث ٹھہرے گی۔ ان شہدائے احد کو یہ بشارت بھی دی گئی تھی: يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۱۷۲) ''وہ اللہ کی طرف سے نعمت اور فضل کی خوشخبری حاصل کرتے ہیں اور بے شک اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شہدائے احد کے لواحقین خواہ مقتول ہونے کی صورت میں شہید ہوں یا طبعی موت سے ہم کنار ہوں، ہر دو صورتوں میں وہ مغفور و مرحوم ہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ رسول اکرم ﷺ کے سب اصحاب صدیقیت وشہادت کے مرتبے پر فائز تھے۔ چنانچہ سورۂ حدید میں ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ط وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ O (۵۷/۱۹) ''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے رب کے نزدیک صدیقین اور شہداء ہیں ان کے لئے ان کا اجر اور نور ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ جہنم والے ہیں۔''

آیت کے نزول کے موقع پر مومنین صرف اور صرف اصحابِ رسول ہی تو تھے پس وہ صدیقین اور شہدا کے گروہ میں شامل ہیں۔ تاہم جس طرح سب رسولوں اور انبیا علیہم السلام کے مراتب و مدارج یکساں نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہیں اسی طرح صدیقین اور شہدا صحابہ کرامؓ کے مراتب بھی یکساں نہیں۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ

(۴) بیعتِ رضوان یہ سلسلہ غزوۂ حدیبیہ:

بسا اوقات مفسرین قرآنی آیات کی تفسیر میں حسب موقع ومحل تمام متعلقہ تفسیری اقوال اور آرا کا ذکر کر دیتے ہیں بعض اوقات ان تفسیری اقوال میں کوئی حقیقی تعارض نہیں ہوا کرتا اگر کہیں تعارض ہو تو بسا اوقات ان میں راجح (قابل ترجیح) اور مرجوح (ناقابلِ ترجیح) اقوال میں تمیز کر لینا مشکل نہیں ہوا کرتا اور کبھی ان مرجوح اقوال پر صغیۂ تمریض ''قیل'' لگایا جاتا ہے یعنی ان اقوال کے ضعیف ہونے کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

ہم نے بیعتِ رضوان سے متعلق سورۂ فتح کی جو آیات نقل کی تھیں وہ پے در پے متعدد بشارات پر مشتمل ہیں: وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا '' اور ان کو بدلے میں فتح قریب دی گئی ہے'' وَ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْ خُذُوْ نَهَا '' اور بہت سی غنیمتیں وہ حاصل کریں گے'' وَعَدَكُمُ اللهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْ نَهَا '' تم سے اللہ نے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر لیا ہے جو تم حاصل کرو گے'' وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْاَحَاطَ اللهُ بِهَا'' اور دوسری غنیمتیں بھی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے بے شک اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے''۔

متعلقہ قرآنی آیات کے مذکورہ اجزا میں ''فتح قریب'' سے بعض کے نزدیک صلح حدیبیہ اور بعض کے نزدیک غزوۂ خیبر مراد ہے۔ اور '' مَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْ خُذُوْنَهَا'' سے مراد غزوۂ خیبر میں حاصل ہونے والے غنائم ہیں اور اس سے فتح خیبر، فتح مکہ اور اس کے بعد دیگر تمام شہروں اور سلطنتوں کی فتوحات بھی مراد لے سکتے ہیں جن سے مسلمانوں کو دنیا اور آخرت میں عزت ونصرت حاصل ہوئی اور غلبہ وعظمت کا ظہور ہوا۔ ''وَعَدَكُمُ اللهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْ خُذُوْنَهَا'' میں مجاہدؒ کے نزدیک قیامت تک کی تمام فتوحات ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ کے دور کی فتوحات بھی بطریقِ اولیٰ شامل ہیں۔ ''وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا'' سے ابن عباسؓ کے نزدیک غزوۂ خیبر، ضحاکؒ اور قتادہؒ کے نزدیک فتح مکہ، حسن بصریؒ کے نزدیک روم وفارس اور مجاہدؒ کے نزدیک قیامت تک کی ہر فتح شامل ہے اور مفسر ابوالسعودؒ کے نزدیک غزوۂ حنین اور ھوازن کے غنائم مراد ہیں۔ ''فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ' (تو جلدی میں تمہیں یہ غنیمت دے دی) سے مراد صلح حدیبیہ یا غزوۂ خیبر کی فتح مراد ہے (۶۴/۱)۔ ظاہر ہے مذکورہ بعض تفسیری اقوال میں جو معمولی اختلاف ہے وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے اور خلفائے راشدینؓ اور ان کی خلافتِ راشدہ کے برحق ہونے پر ہمارا استدلال متعلقہ آیات کے سیاق وسباق اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بالکل درست ہے۔

مقالۂ ہذا کی پہلی دو قسطوں میں غزوہ حنین اور ہوازن کے غنائم کی تقسیم کے متعلق بعض جگہ سہواً

یہ لکھا گیا ہے کہ ان غنائم میں سے مہاجرین اور انصار کو کچھ نہیں دیا گیا تھا بلکہ یہ سب اموال تالیف قلب کے طور پر نومسلم قریش مکہ وغیرہ کو دیئے گئے تھے، اصل واقعہ یہ ہے کہ ان غنائم میں سے مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا جب کہ نومسلم مؤلفۃ القلوب کو ہی غنائم کا بڑا حصہ دیا گیا تھا۔ اس سہو پر راقم الحروف معذرت خواہ ہے۔ تاہم اس سے اصل مضمون اور ہمارا استدلال قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔

(۵) خطا اور نسیان پر معافی کا تعلق اجتہادی مسائل سے بھی ہے:

صحابہ کرامؓ کے معصوم عن الخطا نہ ہونے کی سلسلے میں ہم نے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد امت محمدیہ کو کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت نہیں۔ متعدد دلائل کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن کریم میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کا بار بار حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مجتہدین قرآن کریم میں غور وفکر سے جن مسائل کا استنباط کریں گے، ان مسائل میں ان سے اجتہادی خطا کا صدور عین ممکن ہے۔ ادھر قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اے ہمارے رب! ہم سے اگر نسیان وخطا ہو جائے تو ہمارا مواخذہ نہ کیجئے (۲/۲۸۶) اس سے ثابت ہوا کہ اجتہادی خطا اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا تو جن مسائل میں قرآن وسنت کی روشنی میں یقین قطعی حاصل ہوسکتا ہے ان کے لئے کسی معصوم عن الخطا سے رجوع کی ضرورت ہی نہ رہی اور جن مسائل میں یہ یقین حاصل کرنا ممکن نہیں وہ اجتہادی مسائل کہلاتے ہیں۔ ان میں ظن پر عمل ہوگا جس میں خطا کا گو احتمال ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے خطائے اجتہادی معاف فرمادی ہے لہٰذا ان مسائل میں بھی کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت نہ رہی ورنہ قرآن کریم میں تدبر اور نسیان وخطا پر عدم مواخذہ کی دعا والی قرآنی آیات (معاذ اللہ) عبث ہوں گی حالانکہ اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ یہاں یہ شبہہ باطل ہے کہ چونکہ نسیان وخطاء پر مواخذہ نہ ہونے کا تعلق صرف اجتہادی مسائل سے ہی نہیں بلکہ آیت کا حکم عام ہے لہٰذا اس آیت کا اطلاق اجتہادی مسائل میں خطا پر نہ بھی کیا جائے تو بھی آیت عبث نہیں ہوگی۔ اس شبہے کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دینی مسائل میں مجتہدین کا اجتہاد صرف دینی فریضہ ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی دینی خدمت بھی ہے پس اجتہادی خطا دیگر امور میں خطاء کی نسبت کہیں زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اس پر مواخذہ نہ ہو۔ تو جس خیال اور نظریے کی بنا پر اللہ کا کلام خواہ من کل الوجوہ (ہر ہر حیثیت سے) یا بعض حیثیتوں سے یا کسی بھی ایک حیثیت سے (معاذ اللہ) عبث قرار پاتا ہو، اس خیال اور نظریے کے باطل ہونے میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں لہٰذا ہمارا مذکورہ بالا استدلال درست ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت نہیں۔

(۶) رسول اکرم ﷺ سے ایمانی معیت کن لوگوں کو حاصل ہے؟:

سورۂ تحریم کی ایک آیت کا جزیہ ہے: یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ (۶۵) ''قیامت کے دن اللہ نبی کو اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، انہیں رسوا نہیں کرے گا''۔

چونکہ صحابہ کرامؓ کے بعد کے ادوار کے وہ مسلمان بھی رسوا نہ ہوں گے جو رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے نقش قدم پر چلتے ہیں اس لئے بعض مفسرین نے یوں تفسیر کی ہے کہ جو لوگ از راہِ دین وایمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گے وہ بروز قیامت رسوا نہ ہوں گے۔ تو ان حضرات نے ''والذین معہٗ'' سے دینی معیت مراد لی ہے تاکہ صحابہ کرامؓ کے بعد کے ادوار کے نیک مسلمانوں پر بھی آیت کا اطلاق ہو۔ لیکن چونکہ صحابہ کرامؓ کو رسول اکرم ﷺ سے محض ایمانی، دینی اور روحانی معیت ہی نہیں بلکہ زمانی، مکانی اور جسمانی معیت کے ساتھ ساتھ اعمالِ شریعت مثلاً قتال و جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ، تبلیغ دین وغیرہ امور میں بھی معیت حاصل تھی لہٰذا وہی اس آیت کے اولین مصداق ہیں ورنہ محض ایمانی معیت ہی مراد ہوتی تو آیت میں ''والذین اٰمنوا'' کہنا کافی ہوتا۔ ساتھ ''معہ'' کی قید نہ لگائی جاتی کہ اس قید کے بغیر محض ''والذین اٰمنوا'' ہی سے ایمانی معیت کے مفہوم کو ذہن فوراً قبول کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ایجاز واختصار ہے بلاضرورت قطعاً کسی لفظ کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ پس آیت میں لفظ ''معہ'' صاف بتا رہا ہے کہ آیت کا اولین اور حقیقی مصداق صحابہ کرامؓ ہیں اور تبعاً بعد کے تمام مسلمان بھی اس کے مصداق ہوں گے جو رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے طریقے پر چلیں گے۔

(۷) سورۂ توبہ کی آیت تطہیر:

سورۂ توبہ میں ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَ تُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (۶۶) ''(اے پیغمبر!) تو ان کے مالوں سے صدقہ وصول کر جس کے ذریعے تو انہیں پاک وصاف کرے اور انہیں ستھرا بنائے اور ان کے لئے دعائے رحمت بھی کر، بے شک تیری دعا ان کے لئے سکون واطمینان (کا ذریعہ) ہے۔''

اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ بعض مخلص مومنین سستی اور غفلت کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے تھے وہ اپنی اس لغزش کی تلافی کے لئے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں صدقات لے کر آئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ آپ ان سے صدقہ وصول کر کے ان کی

تطہیر اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لئے دعائے رحمت کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ آپ کے مطیع و فرمانبردار، عاشق و جانثار صحابہؓ بھی اس تطہیر وتزکیہ کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ تو یہ نعمت صرف اہل بیتؓ تک ہی محدود نہیں۔ گو رسول اکرم ﷺ کے اہل بیت میں شامل ہونے کی نعمت ان اہل بیت کے لئے یقیناً ایک اضافی شرف ہے۔ قران کریم میں اس طرح کی آیاتِ تطہیر وتزکیہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تطہیر وتزکیہ سے صحابہ کرامؓ کا معصوم عن الخطا ہونا نہیں بلکہ گناہوں اور لغزشوں کا معاف ہونا اور ان کے اخلاق کا پاکیزہ ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔ یوں وہ سب اپنے گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے۔

(۸) صحابہ کرامؓ کی تعداد:

اس ذیلی عنوان کے تحت ہم نے تیسویں پارے کی سورۃ النصر کا حوالہ بھی دیا تھا اور لکھا تھا کہ اسلام میں لوگوں کے فوج در فوج داخل ہونے کی نعمت پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تسبیح وتحمید کا جو حکم دیا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ یہ نعمت زوال پذیر نہ ہوگی چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے اس نعمت کے شکرانے میں فتح مکے کے بعد چاشت کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا فرمائی تھی تو ہر امیر لشکر پر یہ مستحب قرار پایا ہے کہ وہ مفتوح شہر میں سب سے پہلے آٹھ رکعت نماز پڑھے۔ ایرانی دارالحکومت مدائن کی فتح پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایسا ہی کیا تھا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے اس تسبیح وتحمید کے سلسلے میں یہ تفسیر منقول ہے کہ چونکہ دین اب کامل ہو چکا تھا۔ بعثتِ رسول ﷺ کا مقصد پورا ہو چکا تھا تو رسول اکرم ﷺ کی دنیا سے رحلت کا وقت بھی قریب آ چکا تھا لہٰذا آپ کو زیادہ سے زیادہ تسبیح وتحمید کا یہ حکم دیا گیا جبکہ صحابہ کرامؓ سے منقول دوسری تفسیر کے مطابق رسول اکرم ﷺ کو تسبیح وتحمید کا حکم لوگوں کے کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے اور مکہ مکرمہ کے مفتوح ہونے کی نعمت کے شکر کے لئے دیا گیا (۶۷) دونوں تفسیری اقوال میں کوئی تضاد نہیں کہ جمع نہ ہو سکیں اور صحابہ کرامؓ کے کثیر التعداد ہونے پر ہمارا استدلال قطعاً متاثر نہیں ہوتا کیونکہ فتح مکہ اور لوگوں کے فوج در فوج دین میں داخل ہونے کی خبر کی حیثیت بلاشبہ ان نعمتوں کی بشارت اور خوشخبری کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے نہایت بعید ہے کہ وہ اپنے محبوب ترین بندے افضل الخلائق اور سید الرسل حضرت محمد ﷺ کو ایسی نعمت کی بشارت دے جو مستقبل قریب میں ہی زوال پذیر ہونے والی ہو لہٰذا رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد فتنۂ ارتداد میں اگرچہ لوگوں کی خاصی تعداد ملوث تھی اور کچھ قبائل کے لوگ فوج در فوج دین سے باہر بھی نکلے لیکن اس کے باوجود مہاجرین مکہ، انصارِ مدینہ اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مؤلفۃ القلوب ہرگز مرتد نہیں ہوئے بلکہ ان کے

علاوہ بھی بعض قبائل عرب ارتداد سے محفوظ رہے اور ان سب نے سورۂ مائدہ کی آیت قتالِ مرتدین کے بموجب ان مرتدین کے خلاف جہاد کر کے اور فتنۂ ارتداد کا استیصال کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس فتنے کو کچلنے والے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ اور تمام صحابہ کرام اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ لہٰذا فتح مکہ کے بعد لوگوں کے فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے کی نعمت فتنۂ ارتداد کے باوجود قائم و دائم رہی اور صحابہ کرامؓ کے کثیر التعداد ہونے کی حقیقت کی نفی نہیں ہوئی۔ بلکہ بے شمار مانعین زکوٰۃ وغیرہ تائب ہو کر دوبارہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(۹) سابقون اولون کے متعلق قرآنی آیت کے بعض اہم مباحث:

سورۂ توبہ میں ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۸)۔ ''(قبولِ اسلام اور خدمتِ دین میں) سبقت لے جانے والے اور پہل کرنے والے مہاجرین و انصار سے اور جن لوگوں نے ان کی اچھے طریقے سے پیروی کی ہے سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور ان کے لئے اس نے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کی نیچے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے''۔

مذکورہ آیت کے متعلق درج ذیل مباحث قابلِ توجہ ہیں:

(الف) آیت میں ''مِنْ'' کے بیانیہ ہونے کی بحث:

ہم نے مقالے کی پہلی قسط میں مذکورہ آیت کو زیر بحث لاتے ہوئے ''مِن'' کو بیانیہ قرار دیا تھا کہ سب کے سب مہاجرین و انصار سابقون اولون میں شامل ہیں۔ بعض مفسرین نے ''مِن'' کو یہاں تبعیضیہ قرار دیا ہے کہ سب مہاجرین و انصار سابقون اولون میں شامل نہیں بلکہ ان میں سے بعض سابقون اولون (قبولِ اسلام، ہجرت اور مہاجرین کی نصرت میں سبقت اور پہل کرنے والے) ہیں۔ بعد والے جو بھی ان کی اتباع اچھے طریقے سے کریں گے وہ بشارت میں شامل ہیں اگر ''مِن'' کو تبعیضیہ قرار دیا جائے تو بھی ہمارا استدلال متاثر نہیں ہوتا کہ سب کے سب مہاجرین و انصار بلکہ ان کی پیروی کرنے

والے بعد کے صحابہ کرامؓ سب ہی دوسرے مسلمانوں کے لئے قابل اتباع ہیں چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ جو شخص رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دیں گے جدھر کا رخ خود اس نے کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے (۶۹) نزول آیت کے موقع پر روئے زمین پر مومنین صرف اور صرف صحابہ کرامؓ ہی تو تھے پس ان سب کے راستے کی اتباع کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

سورۂ فتح کی آخری آیت کے آخری حصے میں بھی ہم نے "من" کو بیانیہ قرار دیا ہے اور اس پر خوارج وروافض کو چھوڑ کر پوری امت کا اتفاق ہے کیونکہ اگر یہ "من" تبعیضیہ ہوتا تو اس کا مقام آیت کی ابتداء میں "والذین معه" کے بعد ہوتا۔ ہم نے اس طرح کے "من" کے بیانیہ ہونے کی مثال میں سورۂ مائدہ کی یہ آیت پیش کی تھی: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۰)۔

اس آیت میں بھی "من" بیانیہ ہے آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ قائلین تثلیث تو کافر ہوں اور عذاب کے مستحق ہوں اور کچھ نہ ہوں۔ تاہم بعض مفسرین نے آیت میں "کفروا منهم" کا مطلب یہ لیا ہے "بقو امنهم علی الکفر" یعنی ان میں سے جو کفر پر قائم رہیں اور باز نہ آئیں وہ عذاب الیم کے مستحق ہوں گے۔ یوں انہوں نے "من" کو تبعیضیہ قرار دیا ہے لیکن یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جاتی ہے کہ "کفروا" کا اصل ترجمہ "انہوں نے کفر کیا" ہے نہ کہ "وہ کفر پر قائم رہے" ہے۔ لہٰذا "من" کو یہاں تبعیضیہ قرار دینا مرجوح ہے۔

لیجئے اس طرح کے "من" کے بیانیہ ہونے کا نہایت قوی ثبوت ہم ایک اور آیت سے دیتے ہیں: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ O (۱۷۲) "جن (مسلمانوں) نے (غزوۂ احد میں) زخم کھانے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو قبول کیا (اور قریش مکہ سے مقابلے کے لئے دوبارہ مدینہ منورہ سے رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ نکل پڑے) ان نیک اور پرہیزگار لوگوں کے لئے بڑا اجر ہے۔"

سورۂ آل عمران کی مذکورہ قرآنی آیت کا سیاق وسباق صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں "من" بیانیہ ہے تبعیضیہ نہیں۔ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ اور رسول کی نامساعد حالات میں بھی فرمانبرداری کرنے والے کچھ نیک ہوتے ہیں اور کچھ نہیں اور کچھ تو اجر عظیم کے مستحق ہیں اور کچھ نہیں۔ بیجا تکلف سے یہاں "من" کو تبعیضیہ قرار دینا سیاق کلام کے سراسر خلاف ہے۔

(ب) اتباع غیر معصوم کی بھی مطلوب ہے:

آیت سے روافض وخوارج کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہورہا ہے کہ چونکہ صحابہ کرامؓ معصوم عن الخطا نہیں اس لئے ان کی اتباع نہیں ہوسکتی۔ یہاں اطاعت واتباع میں پائے جانے والے لطیف فرق پر غور کیجئے۔ اطاعت کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ کسی کی بات مان لی جائے یا اس پر عمل کیا جائے خواہ وہ شخص بڑے درجے کا ہو یا چھوٹے کا ہو۔ اطاعت کا دوسرا اور متبادر الی الفہم یعنی ذہن میں فوراً آنے والا مفہوم یہ ہے کہ بڑا شخص چھوٹے کو جس کام کے کرنے کا حکم دے چھوٹا اس پر عمل کرے اور جس کام سے وہ روکے چھوٹا اس سے رک جائے۔ ضروری نہیں کہ بڑا شخص من کل الوجوہ یعنی ہر ہر حیثیت سے دوسرے سے بڑا ہو۔ یعنی اطاعت کا تعلق امر ونہی سے ہے تو اطاعت کرنے والا ''مطیع'' کہلائے گا اور جس کی اطاعت کی جائے وہ ''مُطاع'' ہوگا۔ اطاعت کے معاملے میں ''مطیع'' اور ''مُطاع'' کے درمیان تعلق کی ابتدا مطاع سے ہوگی کیونکہ مُطاع کسی کام کا حکم دے گا یا کسی کام سے روکے گا تبھی تو مُطیع فرمانبرداری کا مکلّف اور پابند ہوگا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ سے خطاء کا صدور عقلاً وشرعاً دونوں طرح محال ہے اور پیغمبروں سے خطاء کا صدور گو عقلاً محال نہیں لیکن شرعاً اس معنیٰ میں محال ہے کہ پیغمبر سے کبھی کبھار بتقاضائے بشریت اجتہادی خطا ہو بھی جائے تو اسے اس پر باقی نہیں رہنے دیا جاتا لہٰذا اللہ اور رسول کی اطاعت ہمیشہ غیر مشروط ہوگی جبکہ دوسروں کی اطاعت اس شرط کے ساتھ ہوگی کہ ان کا امر ونہی خلاف شریعت نہ ہو۔ اطاعت میں حاکم و مطاع کے امر ونہی کی صرف تعمیل ہی کافی نہیں بلکہ دل سے اس کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر کسی معقول عذر کی بنا پر کسی خاص موقع پر تعمیل نہ ہوسکے تو یہ عدم تعمیل ایسی نہیں جسے نافرمانی یا عدم اطاعت کا نام دیا جاسکے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین پر پیش فرمائی تو انہوں نے اس بارِ امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا اور وہ ڈر گئے (۷۲) یا مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضرؑ کا پتہ دیا اور بتادیا کہ وہ اللہ کے مقرب بندے ہیں جنہیں ایک خاص علم دیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس خاص علم کو حاصل کرنے کے لئے ان سے ملے۔ انشاء اللہ کہہ کر ان کے کاموں پر صبر وتحمل سے کام لینے کا وعدہ بھی فرمایا لیکن ازراہ تعجب ان کے ہر کام پر غیر اختیاری طور پر اعتراض اور ناپسندیدگی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اظہار فرمایا اور بالآخر اپنے مقصد کو ادھورا چھوڑ کر واپس تشریف لے آئے۔ یا مثلاً اللہ کے رسولوں کو کفار ومعاندین کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلبہ وتصرف کے وعدہ پر کامل یقین تو تھا لیکن اس وقت کا تعین بعض اوقات انہوں نے محض اپنے ظن وتخمین سے کرلیا تاہم اپنے ساتھیوں سے کبھی یہ دعویٰ

نہیں فرمایا کہ غلبہ ونصرت کا یہی وقت اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ بعد میں یہ اندازے پورے ہوتے دکھائی نہ دیئے تو انہیں اپنے ان اندازوں کے متعلق شکوک وشبہات لاحق ہوئے جبکہ اس ناامیدی کے موقع پر اللہ کی مدد (اصل گھڑی) بھی آ پہنچی (۱/۳/۷) یا مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا گیا کہ قوم لوط کو عذاب دیا جائے گا تو قرآنی متن کے مطابق حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے جھگڑنا یعنی بحث ومباحثہ شروع کر دیا (۲/۳/۷) تو اس طرح کی تمام صورتوں کو (معاذ اللہ) عدمِ ایمان اور عدمِ اطاعت قرار دینا غلط ہوگا گو بظاہر عدمِ تعمیل نظر آئے۔ تو سب یا بعض صحابہ کرامؓ کو بعض مواقع مثلاً صلح حدیبیہ پر اسی نوعیت کے حالات پیش آئے تو ان پر کوئی الزام نہیں کیونکہ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ عدمِ تعمیل کی صورت لازماً عدمِ اطاعت اور نافرمانی کہلائے یا ازراہ تعجب یا اسلام اور مسلمانوں سے شدید جذباتی ہمدردی کی بنا پر اکابر کے سامنے غیر اختیاری افسردہ یا تیز لہجہ یا طرزِ کلام لازماً ہر حالت میں مذموم یا قابل مؤاخذہ ہو۔

اطاعت کے برعکس اتباع کا مفہوم ہے ''کسی کی پیروی کرنا' اس کے نقش قدم پر چلنا، کسی بات طریقے، مسلک اور روش کو اپنا لینا'' یوں اتباع کا دائرہ اطاعت کے دائرے سے بہت وسیع ہے۔ اتباع کرنے والے کو مُتّبِع یا تابع کہا جائے گا اور جس کی اتباع کی جائے وہ ''متبوع'' کہلائے گا۔ تابع اور متبوع میں تعلق کی ابتدا اکثر وبیشتر صورتوں میں تابع کی طرف سے ہوگی چونکہ اللہ اور رسول کے بعد کوئی شخص بھی معصوم عن الخطا نہیں اس لئے جب بھی غیر معصوم کسی کی بھی حتیٰ کہ رسول کی بھی اتباع کرے گا تو اسے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ اتباع صرف ان امور میں ہو جن میں اتباع کی شریعت اجازت دیتی ہو مثلاً رسول اکرم ﷺ نے چار سے زائد نکاح کئے لیکن امتی کے لئے یہ جائز نہیں۔ آپ نے صوم وصال یعنی درمیان میں افطار کئے بغیر روزہ رکھا لیکن امتی کے لئے آپ کے اس فعل کی اتباع جائز نہیں۔ آپ کا وضو نیند سے ساقط نہیں ہوتا تھا دوسروں کا یہ معاملہ نہیں۔ اسی طرح پیغمبر کی اجتہادی غلطی جس پر پیغمبر کو لازماً اطلاع کر دی جاتی ہے اور اصلاح بھی کر دی جاتی ہے، اس میں امتی کو اتباع جائز نہیں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کے لئے استغفار کیا۔ رسول اکرم ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو کسی امتی کے لئے درست نہیں کہ وہ کفار کے لئے استغفار کرے یا ان کا جنازہ پڑھے۔ علیٰ ھذا القیاس اگر امتی کسی غیر معصوم کی اتباع کرے تو متبوع کے غیر شرعی افعال واقوال میں اتباع درست نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر اتباع خواہ معصوم (پیغمبر) کی ہو یا غیر معصوم مثلاً صحابی کی ہو، دونوں صورتوں میں چند شرائط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ جب بعض حیثیتوں سے پیغمبر کی اتباع مشروط ہے یعنی پیغمبر کی اجتہادی خطاؤں اور جو امور پیغمبر ہی کے لئے مخصوص ہیں ان میں اس کی اتباع نہیں ہوگی تو اس مشروط اتباع سے یہ

نتیجہ اخذ کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے کہ پیغمبر (معاذ اللہ) سرے سے ناقابل اتباع ہے یعنی صحابہ کرامؓ یا کسی بھی نیک شخص کی مشروط اتباع سے بھی یہ سمجھ لینا عقلاً ونقلاً غلط ہے کہ وہ اس لئے قابلِ اتباع نہیں کہ غیر معصوم ہونے کی بنا پر ان سے غلطیوں اور گناہوں کا صدور ہوسکتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی تکذیب لازم آئے گی کہ اس نے غیر معصوم سابقون اولون صحابہ کرامؓ کی اتباع کا حکم دے ڈالا بلکہ ہر اس شخص کے راستے کی اتباع کا حکم دے ڈالا جو اللہ کی طرف (ایمان واعمال صالحہ کے ذریعہ) رجوع کرتا ہو: وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (۷۴)۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقون اولون کی اتباع میں ''باحسان'' کی قید لگائی ہے کہ ان کی اتباع اچھے طریقے سے کی جائے یعنی یہاں حسن اتباع مقصود ہے کمالِ اتباع اس معنی میں مقصود نہیں کہ بلاامتیاز تمام امور میں ان کی اتباع کی جائے خواہ یہ شرعاً جائز ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی اتباع میں متبعین کے لئے حسن اتباع مطلوب ومقصود ہے اور یہاں بھی کمالِ اتباع اس معنیٰ میں مطلوب نہیں کہ لازماً تمام امور میں آپ کی اتباع کی جائے چنانچہ سورۂ احزاب میں ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۷۵)

''بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ (کی ذات) میں عمل کے لئے عمدہ نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔''

دیکھئے آیت میں ''اسوة حسنة'' کہا گیا ہے ''اسوة كاملة'' نہیں کہا گیا تاکہ کمالِ اتباع کا مذکورہ غلط مفہوم نہ لیا جائے تو رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی حسن اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ جن امور میں اتباع کا حکم ہے ان میں حتی الوسع کامل اتباع ہو اور جن امور میں اتباع کی اجازت نہیں ان میں اتباع سرے سے درست ہی نہیں۔ تو جن آیات میں رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی بظاہر مطلق اتباع کا حکم ہے وہاں دلائل کی بنا پر یہ حسنِ اتباع ہی مقصود ہے کیونکہ احکام میں اس طرح کی قیود وشرائط دلائل و براہین کی بنا پر معتبر ہوں گی مگر بشارات کی حیثیت احکام کی نہیں بالخصوص جبکہ کسی خاص فرد یا جماعت کو مخصوص کر کے یہ بشارات دی گئی ہوں۔ ان کی حیثیت ایسی خبروں کی ہے جن کی متعلقہ شرائط پہلے ہی پوری ہو چکی ہوتی ہیں تو صحابہ کرامؓ کے متعلق مغفرت ورحمت، غلبہ ونصرت کی جو مطلق بشارتیں ہیں وہ مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مؤلفۃ القلوب قریش مکہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان حضرات نے متعلقہ شرائط پوری کیں اور اللہ کے علم میں وہ ان پر قائم ودائم رہنے والے تھے تبھی تو انہیں مخصوص کر کے یہ بشارات دی گئیں ورنہ ان بشارتوں کے لئے ان کی تخصیص عبث اور بے مقصد ہوگی جو

کلام میں عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔

(ج) اتباع تحقیقی وتقلیدی:

رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب خصوصاً سابقون اولون کی اطاعت ہو یا اتباع، بہر حال مُطیع اور متبع کو کئی امور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ مثلاً جن امور میں وہ اتباع کر رہا ہے فقہی اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟ فرض، واجب، سنت مؤکدہ وغیرہ موکدہ، نفل، مستحب، مباح، حرام، مکروہ تحریمی وتنزیہی وغیرہ کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی (Gradation) کرنی ہوگی۔ نصوص شرعیہ یعنی قرآن وسنت کے متن اور معانی دونوں پر نظر رکھنی ہوگی لہٰذا دیگر متعلقہ علوم صرف ونحو، بلاغت ومعانی وغیرہ نیز عقلی استدلال کے انداز کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ احکام شرعیہ میں ناسخ ومنسوخ، راجح ومرجوح، افضل ومفضول اولیٰ وخلافِ اولیٰ کی معرفت بھی پیدا کرنی ہوگی۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ نصوصِ شرعیہ (قرآن وسنت کی عبارتوں) کی اپنے مفہوم پر دلالت یقینی ہے یا ظنی اور یہ دلالت ایک ہی معنیٰ مفہوم پر ہے یا اس میں متعدد معانی ومفاہیم کا احتمال ہے۔ جن نصوص میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے اسے کیسے دور کیا جائے گا، نئے پیش آمدہ مسائل میں جو قرآن وسنت میں صاف صاف مذکور نہیں ہیں، ان میں شرعی حکم بذریعہ قیاس شرعی کیسے معلوم کیا جائے گا، رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے دور سے جو روایات آئندہ ادوار میں منتقل ہوئی ہیں وہ قطعی الثبوت ہیں یا ظنی الثبوت ہیں یعنی یہ حکم لگانا کہ ہم تک وہ یقینی ذرائع سے پہنچی ہیں یا ظنی ذرائع سے وغیرہ وغیرہ بہت سی باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا طرز کی تحقیقی واجتہادی صلاحیت بہت کم بلکہ بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، باقی لوگ تو ان مجتہدین پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی اتباع پر مجبور ہیں اور اسی اتباع کو اصطلاح میں ''تقلید'' کا نام دیا گیا چونکہ مقلد کو مجتہد پر اعتماد ہوتا ہے لہٰذا وہ اس سے دلیل کا مطالبہ نہیں کرتا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اسے دلیل کا بہر حال علم ہو کیونکہ وہ اجتہادی مسائل میں شرعاً اس کا پابند نہیں ہوتا لیکن دلیل معلوم کر لینا اس کے لئے شرعاً ہرگز ممنوع بھی نہیں۔ دیکھئے باجماعت نماز میں میں مقتدی اپنے امام پر بہت سی باتوں میں مکمل اعتبار کرنے پر مجبور ہے مثلاً وہ اسکا ہرگز شرعاً مکلّف نہیں کہ وہ یہ تحقیق کرتا پھرے کہ امام باوضو ہے یا نہیں، امام نے جس پانی سے وضو کیا ہے وہ پاک ہے یا نہیں، امام کے کپڑے پاک ہیں یا ناپاک، امام نے مثلاً قعدہ کی حالت میں تشہد پڑھا ہے یا مثلاً علامہ اقبالؒ کی کوئی نظم پڑھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ تحقیق کے باوجود یقینی نتائج تک پہنچنا بسا اوقات محال ہوتا ہے لہٰذا کسی شدید شک وشبہ کے بغیر ان امور کی تحقیق میں پڑنا بے سود ہے۔ نماز جیسے اہم دینی فریضہ میں مقتدی کا اپنے امام کی اقتدا کرنا دراصل اس کی مکمل تقلید ہی ہے کہ وہ

مذکورہ امور میں کسی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتا نہ ہی یہ ضروری ہے کہ اسے دلیل کا علم ہو اگر ہو بھی جائے تو اس سے اس کی یہ اقتدا اور تقلید اپنے مقام پر اقتداء ہی کے زمرے میں رہے گی نہ کہ امامت میں بدل جائے گی۔ وہ دینی امور جن میں صواب وخطا، درست و نادرست، راجح و مرجوح، ناسخ ومنسوخ وغیرہ کا یقینی اور قطعی علم حاصل کرنا ممکن ہو، اجتہادی مسائل نہیں کہلاتے اور نہ ہی ان امور میں تقلید درست ہے مثلاً عقائد توحید، رسالت، ایمان بالآخرت اور کئی ایک احکام مثلاً ماں اور بہن وغیرہ نسبی محرمات سے نکاح کا حرام ہونا، سود اور زنا کا حرام ہونا، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا فرض ہونا وغیرہ بآسانی معلوم ہونے والے ایسے یقینی امور ہیں جن میں گہرے غور وفکر (اجتہاد) اور اس کے نتیجے میں دوسروں کے لئے محض اعتماد پر اتباع یعنی تقلید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تاہم اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر یہ انتہائی فضل وکرم ہے کہ کوئی شخص ایسے امور میں بھی تقلید کرے اور حسن اتفاق سے وہ یہ تقلید اہل حق کی کر رہا ہو اور اسی پر اس کا خاتمہ بالخیر ہو تو وہ بھی نجات پا جائے گا۔ تجربے اور مشاہدے سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا ایمان دراصل تحقیقی نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ بات اجتہادی مسائل کی چل رہی تھی تو یہ ایسے دینی مسائل ہیں جن میں صواب وخطا، راجح و مرجوح، افضل و مفضول، اولیٰ وخلافِ اولیٰ اور بعض صورتوں میں ناسخ ومنسوخ کا یقینی وقطعی فیصلہ کرنا دشوار اور محال ہوتا ہے۔ ان مسائل میں مجتہدین اپنے اپنے دلائل وبراہین کی بنیاد پر ایک جانب کو صحیح یا راجح قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کا اختلاف اجتہادی اختلاف ہے جو صحابہ کرامؓ کے دور سے چلا آ رہا ہے چونکہ اس میں کسی بھی جانب اور کسی بھی فریق کو قطعیت سے غلط ٹھہرانا ممکن نہیں لہٰذا کسی سے خطائے اجتہادی سرزد بھی ہو تو عنداللہ مجتہدین اور مقلدین سب کے لئے معاف ہے۔ یہاں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جو اجتہاد کا اہل نہ ہو وہ لازماً تقلید کرے گا اگرچہ وہ خود بھی عالم کیوں نہ ہو چنانچہ قرآن کریم میں ہے: وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۷۶) ''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو وہ اسے (لوگوں میں) پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسی خبر کو رسول کی طرف اور اپنے میں سے اولوالامر کی طرف لوٹائیں تو ان (اولوالامر) میں سے جو استنباط کر سکتے ہیں وہ اسے (ٹھیک ٹھیک) سمجھ پائیں گے''۔

آیت میں رسول کے علاوہ اولوالامر کی طرف بھی رجوع کا حکم ہے جو اس زمانے میں صحابہ کرامؓ ہی میں سے تھے۔ آیت میں ''من'' تبعیضیہ ہے پس سب صحابہ کرامؓ اولوالامر نہ تھے۔ اولوالامر میں صرف حکام ہی نہیں بلکہ علما بھی شامل ہیں۔ حکام اپنی رعایا میں دینی احکام کے اجرا کے پابند ہوتے ہیں اگر وہ خود عالم نہ ہوں تو علما سے رجوع کے پابند ہوں گے یوں الوالامر کی اطاعت دراصل علما کی

اطاعت پر ہی ختم ہوتی ہے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ سب حکام وعلما (اولوالامر) اجتہاد و استنباط کی صلاحیت نہیں رکھتے کیونکہ یہ دوسرا "من" بھی تبعیضیہ ہے۔ اگر بالغرض صلاحیت رکھتے بھی ہوں تو بسا اوقات فرصت نہیں رکھتے۔ اگر فرصت بھی رکھتے ہوں تو جن مسائل میں خیر القرون میں بھرپور اجتہاد ہو چکا ہے ان میں از سر نو اجتہاد کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے۔ پس یہ دعویٰ کہ علما کے لئے تقلید حرام ہے، بظاہر خوش نما ہونے کے باوجود حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے دور میں فقہی علوم بلکہ علوم حدیث کو بھی مدون و مرتب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ دینی مسائل میں لوگوں کے لئے رہنمائی حاصل کرنا دشوار نہ تھا۔ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان علوم شرعیہ کی تدوین وترتیب کی ضرورت بھی پیدا ہوتی چلی گئی اس لئے صحابہ کرامؓ کو فقہی اصطلاحات فرض، واجب، سنت مؤکدہ وغیرہ، علوم حدیث کی اصطلاحات مرفوع، موقوف، صحیح، حسن، ضعیف، خبر واحد، خبر متواتر وغیرہ کی بھی ضرورت نہ تھی وہ رسول اکرم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان اصطلاحات میں پڑے بغیر ہی تمام دینی حقائق سے حسب ضرورت باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک یا چند صحابہ کرامؓ کے نام سے کوئی خاص فقہی مسلک مدون نہ ہو سکا کہ اس مسلک کی پیروی کرنے والوں کو مثلاً ابوبکری، عمری، عثمانی یا علوی وغیرہ کہا جا سکے۔ چنانچہ یہ فقہی مسالک بعد کے ان مجتہدین کے نام سے مشہور ومعروف ہوگئے جن کی مدون فقہ خود ان کے یا ان کے شاگردوں کے ذریعہ آئندہ نسلوں تک نہ صرف علمی تواتر سے بلکہ تحریری طور پر منتقل ہوتی چلی گئی۔ سواد اعظم یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کے ان مجتہدین نے قرآن وحدیث سے نظری اور اسوۂ رسول اور اسوۂ صحابہ سے عملی رہنمائی حاصل کی اور ان میں سے جن کا زمانہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب سے قریب ترین تھا ان کے لئے اس طرح کی رہنمائی حاصل کرنا نسبۃً آسان تر بھی تھا اور زیادہ قابل اعتماد بھی۔ تو ان مجتہدین کی تقلید دراصل رسول اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ ہی کی اتباع ہے۔ اسی معنی میں ہر تقلید اتباع بھی ہے لیکن ہر اتباع کا تقلید ہونا ضروری نہیں مگر چونکہ دلیل معلوم کر لینا مقلد کے لئے شجرہ ممنوعہ نہیں لہٰذا اس صورت میں تقلید اور اتباع میں تساوی کی نسبت ہوگی یعنی دونوں ہم معنیٰ ہوں گے۔ بعض اہل علم نے اتباع اور تقلید کو ایک دوسرے سے قطعاً مغائر (الگ تھلگ) ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے خود قرآن کریم سے اس کی نفی ہو رہی ہے مشرکین عرب سے جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کی اتباع کرو تو وہ جواب میں کہتے تھے: بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ (۷۷) "بلکہ ہم تو اسی طریقے کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے خواہ ان کے

باپ دادا نہ تو کسی چیز کی عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پر ہوں۔''

یعنی مشرکین عرب اپنے آباء واجداد کی اتباع ہرگز کسی عقلی ونقلی دلیل کی بناء پر نہیں کرتے تھے اور یہی تقلید ہے۔ ان کی یہ تقلید اس لئے حرام اور غیر مشروع ہے کہ توحید وشرک میں یقینی امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ توحید یقیناً حق ہے تو کفر وشرک یقیناً باطل ہے۔ چونکہ عقائد میں تقلید یعنی بلا دلیل اتباع اپنی اصل کے اعتبار سے درست نہیں لہٰذا اگر کسی نے اہل باطل کی تقلید کی تو وہ مجرم ہونے کی وجہ سے ماخوذ ہوگا۔ پس اس طرح کی آیات سے حرام اور غیر مشروع تقلید پر استدلال حق بجانب ہے گو کوئی شخص غلط فہمی یا تعصب و عناد کی بنا پر ایسی آیات کو جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب تقلید کی تردید میں پیش کرے لیکن اس سے یہ تو واضح ہوگیا کہ ایسے حضرات بھی اتباع کو تقلید کے معنیٰ ہی میں شعوری یا غیر شعوری طور پر لے رہے ہیں۔ آیت کے مفہوم مخالف سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اگر آباو اجداد عقلمند اور ہدایت یافتہ ہوں تو ان کی اتباع خواہ دلیل سے ہو یا بلا دلیل اتباع یعنی تقلید ہو، درست ہوگی بلکہ مطلوب ومقصود ہوگی۔ اور جس مفہوم مخالف کی تائید دیگر یقینی عقلی ونقلی دلائل سے بھی ہو جائے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(د) اتباع شخصی ومسلکی:

قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کے لئے مشروع یعنی شرعاً جائز اتباع کبھی کسی ایک شخص یا کئی اشخاص کی مطلوب ہوتی ہے تو کبھی کسی خاص مسلک اور طرزِ عمل کی اتباع کا مطالبہ کیا جاتا ہے مثلاً سورۂ آل عمران میں ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۷۸) ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

دیکھئے یہاں خود رسول اکرم ﷺ کو متبوع ٹھہرایا گیا ہے یا مثلاً سابقون اولون صحابہ کرامؓ کی اتباع والی زیر بحث آیت میں سابقون اولون کو متبوع قرار دیا گیا ہے اس طرح کی اتباع میں متبوع من کل الوجوہ (ہر حیثیت سے) یا کسی نہ کسی حیثیت سے تابع اور متبع (اتباع اور پیروی کرنے والے) سے درجے اور مرتبے میں افضل ہوگا۔ لیکن جائز مسلکی اتباع میں محض خاص مسلک اور طریقے کی صحت وعظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور جن اشخاص کے مسلک کی پیروی مطلوب ہو، ان کا پیروی کرنے والے سے افضل ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ نے حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام ودیگر بعض انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر کیا تو رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۹۰) ''یہ وہ (انبیاء) ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی تو

بھی ان کی ہدایت کی پیروی کرو''۔

دیکھئے یہاں رسول اکرم ﷺ کو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ بھی ان پیغمبروں کی اقتدا اور اتباع کریں تاکہ ان پیغمبروں کے آپ سے افضل ہونے کا شبہہ کسی کو لاحق نہ ہو بلکہ یہ فرمایا گیا کہ آپ ان کی ہدایت کی اقتدا یعنی اتباع کریں تاکہ اس ہدایت اور صراط مستقیم کی عظمت سب لوگوں پر واضح ہو کہ جملہ انبیا علیہم السلام اسی کے پابند تھے۔ غور کیا جائے تو امت محمدیہ کے لئے قرآن کریم میں شخصی اتباع صرف رسول اکرم ﷺ اور آپ کے بعد سابقون اولون صحابہ کرامؓ کی خصوصاً و دیگر صحابہ کرام علیٰ صاحبہا السلام کی عموماً مطلوب ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت اور سابقون اولون والی زیر بحث آیت سے واضح ہے۔ یہاں ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے سورۂ طور میں ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (۸۰) ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی اتباع کی تو ہم ان کی اولاد کو (بھی) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔''

یہاں آیت میں گو فعل اتباع کا مفعول اہل ایمان آباؤ واجداد کو بنایا گیا ہے لیکن یہ شخصی اتباع نہیں بلکہ مسلکی اتباع ہے جیسا کہ ''بایمان'' کی قید سے واضح ہو رہا ہے جبکہ سابقون اولون کی اتباع میں ''باحسان'' کی قید ہے کہ سابقون اولون کی اتباع اچھے طریقے سے کی جائے یعنی ان کی شخصی اتباع ایسے کی جائے جسے حسنِ اتباع کہا جا سکے۔ حسن اتباع اور کمالِ اتباع کا فرق گذشتہ مباحث میں مذکور ہو چکا ہے۔ حسنِ اتباع میں ایمان واعمال صالحہ میں اتباع از خود شامل ہے۔

رسول اکرم ﷺ اور اصحاب رسول کے بعد امت میں کسی کی بھی شخصی اتباع مطلوب نہیں گو مسلکی اتباع بشمول صحابہ کرامؓ بھی نیک لوگوں کی مقصود ومطلوب ہے یعنی شخصی اتباع میں مسلکی اتباع بھی داخل ہے لیکن مسلکی اتباع کا شخصی ہونا ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (۸۱) ''اور تو اس شخص کے راستے کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہو۔''

یہاں آیت ''سبیل'' کا لفظ لا کر مسلکی اتباع کی ہدایت کی گئی ہے خواہ یہ مسلکی اتباع ایک نیک شخص کی ہو یا متعدد کی ہو کیونکہ ''من'' کے مفہوم میں فرد واحد بھی شامل ہے۔ سورۂ نساء میں ہے: ''کہ جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کی بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے (سبیل) کے علاوہ کسی اور راستے کی پیروی کرے (ویتبع غیر سبیل المؤمنین) تو اسے ہم اسی طرف پھیر دیں گے جدھر کا اس نے خود رخ کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم برا ٹھکانا ہے''۔ (۸۲)

یہاں امت کے اجماع کا حجت ہونا بیان کیا گیا ہے۔ نزولِ آیت کے موقع پر یہ مومنین

اگر چہ صحابہ کرامؓ ہی تھے لیکن بعد کے ادوار کے مومنین کا اجماع بھی حجت (معتبر ومستند) ہے لہٰذا آیت میں جس اتباع کا ذکر ہے وہ مسلکی اتباع ہے جیسا کہ آیت میں لفظ "سبیل" سے واضح ہو رہا ہے۔ پس ائمہ مجتہدین کی اتباع بھی خواہ دلیل سے ہو یا بلا دلیل ان کی بات مانی جائے مسلکی اتباع ہے بالفاظ دیگر تقلید دراصل مسلکی تقلید ہے، شخصی تقلید نہیں گو عام لسانی محاورات میں اسے شخصی تقلید کا غلط نام دیا جاتا ہے۔ مسلکی تقلید ایک شخص کی بھی از روئے قرآن درست ہے جیسا کہ آیت "واتبع سبیل من اناب الی" میں "من" کے مفہوم میں بالاتفاق شخصِ واحد بھی داخل ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۸۳) "جو شخص (خانہ کعبہ اور حدود حرم میں) داخل ہوا سے امن حاصل ہوگا۔"

آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ایک شخص داخل ہو تو اسے امن حاصل نہ ہوگا زیادہ داخل ہوں تو مامون ومحفوظ ہوں گے۔ تو ان ائمہ مجتہدین کی تقلید واتباع شخصی نہیں بلکہ مسلکی ہے اور افراد امت اس اعتماد اور بھروسے پر ان کے مسلک کی اتباع کرتے ہیں کہ یہ ادلہ شرعیہ (شرعی دلیلوں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) پر مبنی ہے اور سنت میں سنتِ رسول کے علاوہ سنت خلفائے راشدینؓ اور سنتِ صحابہؓ بھی شامل ہے جس کی وضاحت آئندہ سطور میں آرہی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے بعد سابقون اولون کی خصوصاً اور دیگر اصحاب رسول کی عموماً جو شخصی اتباع مطلوب ہے اس سے صحابہ کرامؓ کو امتِ محمدیہ میں دیگر افرادِ امت کے مقابلے میں امتیازی مقام حاصل ہے چنانچہ درج ذیل نکات قابلِ توجہ ہیں:

(۱) کسی بھی دینی امر میں اگر مرفوع حدیث موجود نہ ہو یعنی ایسی روایت وحدیث موجود نہ ہو جس کی سند رسول اکرم ﷺ تک پہنچتی ہو تو اس میں صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال حدیث نبوی کے قائم مقام سمجھے جائیں گے اسی لئے حدیث کے مفہوم میں توسع (وسعت) پیدا کرتے ہوئے کتبِ احادیث میں صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال بھی مذکور ہوتے ہیں۔

(۲) اگر کسی دینی امر میں مرفوع حدیث یا احادیث کا تعارض صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال سے ہو رہا ہو اور یہ روزمرہ کے ایسے مسائل ہوں جن کے متعلق یہ سوچا بھی نہ جا سکتا ہو کہ اس میں کسی صحابی یا اصحاب نے اپنی رائے اور عقل سے دخل دیا ہے یعنی یہ مسائل مُدرک بالقیاس نہ ہوں تو صحابہ کرامؓ سے متعلق ان روایات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں مرفوع احادیث کے قائم مقام ٹھہرا کر ایسے تعارض کو مرفوع احادیث میں تعارض قرار دیا جائے گا کیونکہ بسا اوقات ایسے کسی مسئلے میں خود مرفوع احادیث میں بھی تعارض واقع ہوتا ہے جسے سمجھنا اور دور کرنا یا مخالف اقوال میں تطبیق پیدا کرنا مجتہدین علماء کا کام ہے۔

(۳) صحابہ کرامؓ خصوصاً سابقون اولون اور پھر ان میں بھی خصوصاً خلفائے راشدینؓ کا

اجماع دین میں زبردست حجت ہے۔ اگر یہ اجماع بظاہر کسی مرفوع حدیث حتیٰ کہ قرآن کریم کی کسی عبارت کے ظاہری مفہوم کے خلاف نظر آتا ہوتو بھی اس اجماعی رائے کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ قرآن کریم اور سنتِ رسول کو سب اصحاب سمجھ نہ پائے ہوں اوراس کے خلاف اجماع قائم کرلیں جبکہ بعد والے انہیں ٹھیک سمجھ پائیں۔ صحابہ کرامؓ کی شخصی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرآن کریم اوراسوۂ رسول کوانہوں نے سمجھا ہے آنے والی نسلیں اس میں ان کے اتباع کی پابند ہیں مثلاً اسلامی عقائد کی جو وضاحت ان سے منقول ہے وہی معتبر ہے مثلاً ختم نبوت کا جومفہوم ہم تک صحابہ کرامؓ سے طبقاتی تواتر سے منتقل ہوا ہے وہی صحیح ہے اور مثلاً قرآن کریم میں ہے: **لَاتَاْکُلُوْا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً** (۸۴) ''یعنی سود کئی کئی گنا کر کے نہ کھاؤ۔''

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ معمولی اور تھوڑا سود حلال ہونا چاہئے لیکن یہ مفہوم مردود ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اسے ہرگز قبول نہیں کیا۔ اجتہادی مسائل کے اختلاف میں بھی یعنی فروعی مسائل کے اختلاف میں بھی صحابہ کرامؓ کے دائرے سے باہر نکل جانا گمراہی ہے۔ دین میں ایسے کام اور ایسی باتیں داخل کرنا جن کے اسباب اور وسائل اور مبینہ ضرورتیں خود رسول اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے دور میں بھی موجود تھیں لیکن انہوں نے یہ کام نہیں کئے تو یہ سب کام **احداث فی الدین** یعنی بدعتِ سیۂ میں داخل ہوکر مردود ہوں گے۔

(۴) اگر خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی اتباع کا یہ مطلب ہو کہ صرف انہی کاموں میں ان کی اتباع ہوگی جو ہو بہو رسول اکرم ﷺ سے بھی ثابت ہوں تو خود سوچئے کہ جب رسول اکرم ﷺ کی اتباع کا حکم ہی کافی تھا تو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول نے آخر ان صحابہ کرامؓ کی اتباع کا حکم ہی کیوں دیا؟ سابقون اولون والی آیت میں تو رسول کریم ﷺ کا ذکر بھی نہیں بس ان کی اتباع دراصل رسول کریم ہی کی اتباع ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها و عضّوا علیها بالنواجذ** (۸۵) ''سوتم میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو جو ہدایت یافتہ ہیں اسے مضبوطی سے تھامو اور اسے اپنی ڈاڑھوں سے پکڑو''

نیز آپ نے فرقۂ ناجیہ یعنی نجات پانے والے گروہ کی یہ علامت بیان فرمائی ہے: **ما انا علیه واصحابی** (۸۶) ''(وہ طریقہ نجات والا ہے) جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔''

تو سنت میں صرف سنت رسول ہی نہیں بلکہ سنت خلفائے راشدینؓ اور سنتِ صحابہؓ بھی شامل ہے جسے اکثر صحابہ یا سب نے اختیار کیا ہو۔ کیونکہ سنتِ رسول کو صحابہ کرامؓ سے زیادہ سمجھنے والا دوسرا کوئی

شخص نہیں ہوسکتا ہاں بعد میں پیش آنے والے نئے نئے مسائل کے سلسلے میں قران وسنت میں غور وفکر سے مسائل کے استنباط میں بعد والے ایسی چیزیں بیان کریں جن تک صحابہ کرامؓ کا ذہن اس لئے نہیں پہنچا تھا کہ یہ مسائل ان کے دور میں پیش ہی نہیں آئے تھے تو اس سے صحابہ کرامؓ کی عظمت مجروح نہیں ہوتی۔ شرابی کے متعلق رسول اکرم ﷺ نے کوئی حتمی سزا مقرر نہیں فرمائی تھی بلکہ اسے ہاتھوں، پاؤں یا بٹے ہوئے کپڑے سے مارا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے تھے کہ اگر حدّ کے اجراء میں کوئی مجرم مرجائے تو مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن اگر شرابی کی جان چلی جائے تو میں اس کی دیت یعنی خون بہا دینا پسند کروں گا پھر فرماتے ہیں: **ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یسنہ** (۸۷) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس سلسلے میں) متعین سنت نہیں ہے''۔

نیز حضرت علیؓ سے صحیح مسلم میں منقول ہے: **جلد النبی ﷺ اربعین و ابوبکر اربعین و عمر ثمانین و کل سُنَّۃ** (۸۸) ''رسول اکرم ﷺ نے (شرابی کو) چالیس کوڑوں کی سزا دی ابوبکر نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور عمر نے اسی کوڑے لگائے اور یہ سب سنت (میں داخل) ہے۔''

حضرت عمرؓ کا بیس تراویح باجماعت کو بدعت کہنا لغوی معنی کے اعتبار سے ہے نہ کہ شرعی اصطلاح کے اعتبار سے۔

الغرض اللہ تعالیٰ کے بعد اصل اتباع تو رسول اکرم ﷺ ہی کی ہے، صحابہ کرامؓ کی (من حیث الجماعۃ) اتباع اس لئے نہایت اہم ہے کہ قرآن اور اسوۂ رسول کو جیسے انہوں نے سمجھا ہے وہی حق ہے اس کے ماسوا باطل ہے۔

(۵) صحابہ کرامؓ رسول اکرم ﷺ کی طرف جس قول وفعل کو منسوب کریں اس میں ان پر مکمل اعتماد کیا جائے گا۔ انہیں جرح وتعدیل کی بحثوں کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ رسول اکرم ﷺ کے بعد وہ اولین معیار حق ہیں ورنہ انہیں اہلِ حق کہنا ہی غلط ہوگا۔ معلوم العاقبۃ اور مغفور ومرحوم ہونے کی وجہ سے غیر معصوم ہونے کے باجود وہ گناہوں سے پاک صاف کردیئے گئے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے تطہیر وتزکیے کے عمل سے وہ سب ہی گزرے ہیں۔

(۶) چونکہ ان کی شخصی اتباع مطلوب ہے لہٰذا دیگر افراد امت سے صحابہ کرامؓ افضل ہیں اور ائمہ مجتہدین کی مسلکی اتباع مطلوب ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ ان کا کوئی مقلد علم وتقویٰ کی بنا پر اللہ کے نزدیک ان سے بڑھ جائے۔

(۷) اللہ تعالیٰ چونکہ اصحاب رسول سے راضی ہوچکا اور وہ اللہ سے راضی ہوچکے اور چونکہ اللہ

فاسقوں سے راضی نہیں ہوا کرتا لہٰذا صحابہ کرامؓ ہرگز فاسق نہیں ان کے فاسق نہ ہونے کا یہ فیصلہ دلائل کی بنا پر یقینی وقطعی ہے دوسروں کے متعلق ایسا فیصلہ ان کے ظاہری حالات کے پیش نظر حُسن ظن پر مبنی ہوگا۔

اگر بالفرض کوئی صحابی کسی وقت فاسق تھا بھی تو بھی بالآخر فاسق نہ رہا جیسے برادران یوسف علیہ السلام کبائر میں ایک وقت میں مبتلا ہونے کے باوجود بالآخر فاسق نہ رہے۔ لہٰذا ولیدؓ بن عقبہ جیسے حضرات کے متعلق شبہات لغو ہیں۔

(۸) سابقون اولون کی اتباع والی زیر بحث آیت میں 'باحسان'' کا ترجمہ ''اچھے طریقے سے'' اتباع ہے۔ اس کا ترجمہ ''اچھے کاموں میں'' اتباع نہیں۔ امامیہ حضرات کے نزدیک سیدنا حضرت علیؓ معصوم عن الخطا ہیں اور آپ بالاتفاق سابقون اولون میں بھی شامل ہیں لہٰذا آپ کے متعلق یہ کہنا کہ صرف ''اچھے کاموں میں'' آپ کی اتباع ہوگی، ان کے عقیدے کی نفی کرے گا۔ صحابہ کرامؓ کے حسن اتباع میں یہ بات از خود شامل ہے کہ خطاؤں اور لغزشوں میں ان کی اتباع اس طرح نہ ہوگی کہ ان کا ارتکاب کیا جائے البتہ اس معنیٰ میں اتباع یہاں بھی ہوگی کہ جن گناہوں کو صحابہ کرامؓ نے گناہ سمجھا ہم بھی انہیں گناہ سمجھیں اور جن لوگوں سے کبھی کبھار ان کا صدور ہوا تو جس طرح انہوں نے توبہ کی ہم بھی توبہ کیا کریں۔ عموماً گمنام اور کم شہرت یافتہ صحابہ کرامؓ سے اس طرح کی غلطیاں کبھی کبھار سرزد نہ ہوتیں تو اسلامی نظام تعزیرات وحدود میں ہماری رہنمائی کیسے ہوتی؟

(۱۰) قدح صحابہؓ وبالِ جان:

سورۂ بقرہ میں منافقین کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ: ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لے آؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے سفہاء (بے وقوف) ایمان لائے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۸۹) ''خبردار! بے شک یہی منافقین ہی بے وقوف ہیں لیکن علم نہیں رکھتے۔''

ہم نے اس سلسلے میں مقالہ ہذا کی پہلی قسط میں لکھا تھا کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کو جو شخص جو طعنہ یا الزام بھی دے گا وہ اسی پر پلٹ آئے گا اور عقل کے ماؤف ہو جانے کی وجہ سے اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ یہ ہم نے محض جوش محبت اور زورِ عقیدت کی بنا پر نہیں لکھا ہم اسے چند مثالوں سے سمجھائے دیتے ہیں۔ مثلاً زید ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں فلاں صحابی کو رسول اکرم ﷺ کی صحبت سے فائدہ

اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا اس لئے ان کے ذہن اور سیرت کی پوری قلب ماہیت نہیں ہوئی تھی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود زید کے ذہن اور سیرت کی بھی قلب ماہیت ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر ہوئی ہے تو یہ دعویٰ عقلاً ونقلاً دونوں طرح باطل ہے فرض کیجئے زید کے نزدیک اس قلبِ ماہیت کے لئے کم از کم دس سالہ صحبتِ نبوی کی ضرورت ہے تو جسے پانچ سال کی صحبت ورفاقت حاصل ہوئی تو اس کے ذہن وسیرت کی پچاس فیصد قلبِ ماہیت ہوئی اور جسے مثلاً دوسال کی صحبتِ رسول حاصل ہوئی اسے یہ قلبِ ماہیت بیس فیصد حاصل ہوئی پس جسے زید کی طرح ایک ثانئے (سیکنڈ) کے کروڑویں حصے کی بھی صحبتِ رسول حاصل نہیں، خود زید کے اپنے ہی مفروضے کے مطابق اس کے ذہن وسیرت کی قلبِ ماہیت سرے سے ہوئی ہی نہیں تو زید کا یہ دعویٰ کہ فلاں فلاں صحابی کے ذہن وسیرت کی قلب ماہیت نہیں ہوئی تھی کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اگرچہ میں نے سونے اور چاندی کی صورت تک کبھی نہیں دیکھی لیکن میں ان دھاتوں کی کھوٹ کو ماہر صرافوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ سے زیادہ باخبر اور عارف باللہ کون ہوسکتا ہے؟ صحابہؓ نے رحمان کی شان رسول اکرم ﷺ سے معلوم کی تھی لہٰذا بعد والے ان کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتے، پس اگر زید دعویٰ کرے کہ علما، صلحا اور اولیا کی صحبت سے بھی ذہن وسیرت کی قلبِ ماہیت ہوسکتی ہے تو سوادِ اعظم کے نزدیک یقینی اور قوی دلائل کی بنا پر کسی بڑے سے بڑے ولی کا مقام ومرتبہ کسی ادنیٰ درجے کے صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا چنانچہ اس کی ایک قرآنی دلیل تو ابھی اوپر مذکور ہوچکی ہے، پس جب یہ شق باطل ہوگئی کہ زید کے ذہن وسیرت کی قلبِ ماہیت ہوچکی ہے تو دوسری شق خود بخود ثابت ہوگئی کہ صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کے سمجھنے کے معاملے میں اس کے اپنے ہی ذہن وسیرت کی سرے سے قلبِ ماہیت نہیں ہوئی تو وہ صحابہ کرامؓ پر کیسے رائے زنی کررہا ہے؟ وہ تو خود اپنے ہی جال میں پھنس رہا ہے۔

یا مثلاً عمرو یہ کہتا ہے کہ شیخین حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما (معاذ اللہ) منافق تھے۔ تو اس کے اس مفروضے کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے لوگوں کو دھوکہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مثلاً سورۂ توبہ میں منافقین کی ذلت ورسوائی کی خبریں دیں اور مثلاً سورۂ نور میں مومنین مخلصین سے آیت استخلاف کے تحت مضبوط ومستحکم خلافت کا اور دین کے غلبے کا وعدہ فرمایا۔ قرآن میں جابجا مثلاً سورۂ فتح کے آخری رکوع میں غلبہ اسلام کی خبر دی اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ اس خبر کے سچے ہونے پر بطور گواہ کافی ہے لیکن اس کے برعکس مذکورہ مفروضے کے تحت اس نے خلافت تو (معاذ اللہ) منافقین کو دیدی اور مومنین کو مغلوب ومجبور کردیا کہ وہ (معاذ اللہ) تقیہ وکتمان کی حالت میں پر زندگی گزاریں۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنے آخری مرض میں سیدنا

حضرت ابوبکرؓ کو مسجدِ نبوی میں نماز پڑھانے کے لئے مقرر فرمایا۔ کوئی شخص مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت پر اصل مستحقین کو نظر انداز کر کے از خود زبردستی امام نہیں بن سکتا۔ پس عمرد کے مفروضے کے تحت اللہ اور اس کے رسول دونوں پر سخت الزام عائد ہوتا ہے اور ایسے مفروضات کو عقیدہ وہی بنائے گا جو اللہ اور اس کے رسول سے مخلص نہ ہو۔ منافق بھی مخلص نہیں ہوا کرتا پس شیخین تو ہرگز منافق نہیں البتہ خود عمرو اپنے ہی مفروضے کے تحت کتاب اللہ کی روشنی میں منافق ٹھہرتا ہے۔

یا مثلاً بکر کہتا ہے کہ حضرت معاویہؓ باغی تھے یا ان کی حکومت سلطانِ جور (ظلم وزیادتی کی حکومت) تھی یا انہیں فاسق سمجھتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بکر کو اپنے متعلق یہ قطعی یقین ہے کہ اس کی موت ایمان اور اعمال صالحہ پر ہوگی؟ اگر اسے یقین ہے تو اس کے متعلق وحی تو موجود نہیں یقیناً اس نے اپنی عقل سے فیصلہ کیا ہوگا۔ عقل میں بالاتفاق خطاء کا احتمال ہے لہٰذا دوسری شق ہی صحیح ہوسکتی ہے کہ بکر کو اپنی عاقبت کا یقینی علم نہیں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اس کا یقینی علم ہے اس لئے وہ مجہول العاقبۃ ہے گو شیطان نے اسے معلوم العاقبۃ ہونے کا فریب دے رکھا ہو۔ ادھر تمام اصحابِ رسول معلوم العاقبۃ ہیں کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح اعلان ہے کہ وہ اپنے نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا (۹۱) پس دیگر صحابہ کرامؓ کی طرح حضرت معاویہؓ کے حسنِ عاقبت کا بھی ہمیں یقینی علم قرآن کریم سے حاصل ہوگیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت معاویہؓ صحابی ہی نہیں ہیں بلکہ (معاذ اللہ) منافق تھے تو سورۂ تحریم میں مذکورہ مضمون والی آیت کے ساتھ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا ہے کہ: ''اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر بے شک ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے (۹۲)۔''

رسول اکرم ﷺ نے ہرگز ہرگز حضرت معاویہؓ پر کوئی سختی نہیں فرمائی بلکہ الٹا انہیں اپنا کاتب وحی مقرر فرمایا ان کے والد حضرت ابوسفیانؓ کے گھر کو فتح مکہ کے بعد دارالامان قرار دیا، پورے خاندان کا آپ نے بے حد اعزاز واکرام فرمایا (۹۳) اگر کہا جائے کہ سختی کرنے کا کوئی موقع پیش نہیں آیا تھا تو اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ اسے پتہ بھی تھا کہ منافقین پر سختی کرنے کا موقع رسول اکرم ﷺ کو پیش نہیں آئے گا پھر بھی خاص رسول اکرم ﷺ ہی کو مخاطب کر کے منافقین کے خلاف جہاد اور ان پر سختی کرنے کا ایک طرف تو حکم دے ڈالا دوسری طرف آپ کو یہ بتایا تک نہیں کہ جس خاندان پر آپ اتنی عنایات فرما رہے ہیں یہ تو (معاذ اللہ) فی الحال منافق ہے یا آپ کے بعد (معاذ اللہ) مرتد اور باغی ہو جائے گا۔ اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ پس جب بکر مجہول العاقبۃ ہونے کے باوجود معلوم العاقبۃ اصحابِ رسول کو (معاذ

اللہ) باغی قرار دے گا تو یقیناً اپنی حد سے تجاوز کرے گا۔ حد سے تجاوز ہی تو ظلم اور بغاوت ہے پس بکر ظالم اور باغی ہوا اور اس کی بدظنی بلکہ بہتان کا شکار صحابہ کرامؓ مظلوم ہوئے۔ اگر ان مظلوموں نے مثلاً حضرت معاویہؓ نے قیامت کے دن ایسے ظالموں کو خدانخواستہ معاف نہ کیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے خصوصاً جبکہ بکر کے دل میں کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض اور نفرت بھی ہو محض فکری لغزش نہ ہو۔ حضرت معاویہؓ کا حلم اور بردباری ضرب المثل ہے، ظن غالب ہے وہ ایسی فکری لغزش والوں کو معاف کر دیں گے لیکن جن کے دلوں میں انکے خلاف بغض ہے تو ممکن ہے حضرت معاویہ یہ کہیں: ''اے اللہ! اگر حضرت علیؓ نے مجھے بالفرض باغی کہا تھا تو وہ مقام و مرتبے میں مجھ سے بلند اور وصفِ صحابیت میں میرے شریک ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام سے مقام و مرتبے میں بلند اور وصفِ نبوت میں ان کے شریک ہیں۔ تو جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارونؑ سے سختی سے پیش آنا اور انہیں ان کی ریش مبارک سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا دوسروں کے لئے قطعاً یہ جواز پیدا نہیں کرتا کہ وہ بھی حضرت ہارونؑ سے اس طرح کا رویہ اختیار کریں۔ اسی طرح میرے بھائی حضرت علیؓ کو تو مجھے باغی وغیرہ کہنے کا حق ہوسکتا ہے لیکن اپنی حیثیت اور انجام سے بے خبر بعد کے لوگ مجھے باغی قرار دینے والے کون ہوتے ہیں؟ اگر میں واقعی انہیں باغی اور فاسق و فاجر نظر آ رہا تھا تو یہ برادرانِ یوسفؑ کے حال پر ہی غور کر لیتے۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا۔ اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کو دھوکہ دیا ان سے جھوٹ بولا۔ سالہا سال تک انہیں پریشان کئے رکھا۔ انہیں رلائے رکھا حتیٰ کہ ان کی بینائی تک متاثر ہوئی لیکن اے اللہ! جب تو نے انہیں معاف فرما دیا اور ان کی مغفرت کا ذکر قرآن کریم میں یوں فرمایا کہ ان کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کر دیا اور ان کے والد ماجد نے ان کے لئے استغفار کیا (جو اللہ کے حکم اور اجازت کے بغیر ممکن نہیں) تو کسی کے لئے تو نے ان کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہ چھوڑی۔ کسی کے لئے یہ جواز نہ چھوڑا کہ وہ عدل عدل کی دہائی دے اور اس طرح کے تبصرے کرے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سکھا شاہی نہیں۔ اے اللہ! کسی سے عدل کرنا ہو یا کسی کو معاف فرمانا ہو تو ہرگز تو لوگوں سے پوچھ کر ایسا کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اسی طرح اے اللہ! جب تو نے تمام اصحابِ رسول کی مغفرت فرما دی اور قرآن کریم میں اس مضمون کو جا بجا مختلف طریقوں سے بیان فرما دیا اور یہ بھی اعلان فرما دیا کہ اللہ بروز قیامت نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا تو ہمارے بعد کسی کو کیا حق تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بزعم خویش انصاف کا سبق پڑھانے لگے اور میرے خلاف یا کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض و نفرت رکھتا ہوا۔ لب کشائی کرتا پھرے؟۔''

ممکن ہے اس مشکل گھڑی میں بکر رسول اکرم ﷺ سے سفارش کی امید رکھے لیکن اسے آپ سے یہ سننا پڑے کہ ''منافقین میرے اصحاب پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے تھے تو مجھے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یوں بددعا کرنے کا حکم دیا :۔ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ (۹۴)۔''تم اپنے غصے میں مرجاؤ۔''

تو جو میرے اصحاب کا دشمن ہو اس کے لئے مجھے بددعا کرنے کا حکم ہے نہ کہ مجھے سفارش کرنے کی اجازت ہے۔اور میرے اصحاب ہی کے ذریعہ تم تک دیگر بہت سی باتوں کے علاوہ میری یہ بات بھی پہنچ چکی تھی کہ میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔جس نے ان سے محبت رکھی میری وجہ سے رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے میرے ساتھ بغض رکھتے ہوئے ان سے بغض رکھا''۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے سب صحابہ کرامؓ کو گناہوں سے پاک صاف کر کے انہیں مغفور ومرحوم ٹھہرایا ہے تاہم جس طرح معصوم عن الخطاء ہونے کے باوجود انبیاء کرام علیہم السلام کے باہم مدارج ومراتب یکساں نہیں اسی طرح صحابہ کرامؓ کے مغفور ومرحوم اور گناہوں سے پاک وصاف ہونے کے باوجود باہم مراتب یکساں نہیں ہیں۔

(۱۱) حکمتِ صحابہؓ:

سفہاء کا متضاد لفظ حکماء (عقلمند) ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ اصحاب رسول ہرگز سفہاء نہیں بلکہ انہیں ایسا کہنے والے منافقین ہی سفہاء یعنی بے وقوف ہیں تو مفہوم مخالف کے طور پر یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ صحابہ کرامؓ حکماء ہیں۔رسول اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کریم میں جابجا یہ کہا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں پس آپ کی تعلیم وتربیت سے صحابہ کرامؓ حکماء میں شامل ہیں اور یہ سب کے سب کامیاب مُعلّم کے کامیاب متعلم (شاگرد) ہیں۔جس مفہوم مخالف کی تائید وتوثیق صراحۃ النص (صاف اور واضح عبارت) سے بھی ہوجائے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا۔چنانچہ قرآن کریم میں ہے: وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۹۵)''یعنی نصیحت عقل مندلوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں''۔

اس مفہوم کی اور بھی بہت سی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں۔صحابہ کرامؓ کے حکماء ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون وغیرہ کی طرح فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کیا کرتے تھے یا بظاہر بہت پڑھے لکھے تھے۔غیر مسلم (نام نہاد) حکماء وفلاسفہ اپنی ظاہری حکمت ودانش اور اعلیٰ تعلیم کے باوجود محروم کے محروم ہی رہے جبکہ کئی ایک صحابہ کرامؓ بظاہر ناخواندہ اور گنوار ہونے کے باوجود حسبِ مراتب صحیح معنوں میں صاحبِ حکمت ودانش تھے کہ انہوں نے حق کو قبول کیا اور باطل کو دھتکار دیا اور اپنی اخروی زندگی کو کامیاب بنالیا جو ہمیشہ کی زندگی ہے۔رضی اللہ عنھم اجمعین۔

تعلیم وتربیت کا ایک حکیمانہ انداز یہ بھی ہے کہ کسی گروہ، جماعت یا قوم کے افضل ترین شخص کو بطور وعظ ونصیحت اور تذکیر وتبلیغ مخاطب کرتے ہوئے اس کے ذریعہ سنانا دوسروں کو مقصود ہوتا ہے مثلاً قرآن کریم میں رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۹۶) ''تو اگر تجھے اس کتاب کے متعلق شک ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے تو پھر ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب (تورات) پڑھتے ہیں (یعنی اہل کتاب سے پوچھ لے جو انصاف پسند ہیں) بے شک تیرے پاس حق آ پہنچا ہے تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کو (معاذ اللہ) واقعی قرآن کریم کے متعلق کوئی شک وشبہہ ہو رہا تھا بلکہ آپ کے ذریعہ سنانا دوسروں کو مقصود ہے۔ اسی طرح مثلاً ایک روایت کی مطابق رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فرمایا تھا کہ تم میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی خفیہ طریقے سے چلتا ہے وغیرہ تو یہ محض وعظ ونصیحت ہے نہ یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ (معاذ اللہ) شرک میں مبتلا تھے۔ ان کے ذریعہ سنانا دوسروں کو مقصود ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ و دیگر صحابہ کرامؓ تو بموجب آیت قتال مرتدین اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ ان سے محبت رکھتا ہے کہ انہوں نے ہی فتنۂ ارتداد کو کچلا تھا اور آپ آیت استخلاف کے بھی مصداق ہیں جس میں خلفائے راشدین کے لئے مستحکم خلافت کی پیشگوئی ہے اور جس میں آپ کے اور جملہ صحابہ کرامؓ کے مومن کامل اور نیک وصالح ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

(۸) تاریخ وحدیث کا کتاب اللہ سے تعارض:

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت کی تعریف کی گئی ہے۔ موجودہ بائیبل میں طالوت ہی کو ساؤل کہا گیا ہے۔ بائیبل نے ساؤل اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیان سخت چپقلش دکھائی ہے یہ بھی لکھا ہے کہ ساؤل پر شیطانی روح کا بھی تسلط ہو جاتا تھا (۹۷) قرآن کریم نے تمام انبیا علیہم السلام کو صالح قرار دیا ہے جبکہ موجودہ بائیبل میں ان پر نہایت ہی گھٹیا اور شرمناک الزامات لگائے گئے ہیں (۹۸)۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول تھے بائیبل کے عہد نامہ جدید میں انہیں خدا اور خدا کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے نہ قتل کیا اور نہ ہی انہیں سولی دی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا لیکن موجودہ بائیبل یہ کہتی ہے کہ یہودیوں نے انہیں مصلوب کر دیا تھا (۹۹) اور یہود ونصاریٰ آج بھی یہی کہتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا

برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا امریکانہ جیسی معتبر سمجھی جانے والی کتب بھی اس دروغ بے فروغ سے آلودہ ہیں۔ بائیبل کے واقعات کی حیثیت ان کے ہاں مقدس تاریخ کی ہے بلکہ بائیبل میں تواریخ کے نام سے کتاب بھی شامل ہے۔ نئے عہد نامہ کی اناجیل اربعہ اور رسولوں کے اعمال وغیرہ کی حیثیت تاریخی بیانات ہی کی ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی تاریخ مقدس بھی نہیں۔ عیسائیوں نے حضرات انبیاء علیہم السلام پر شرمناک الزامات لگائے یا انہیں قبول کرلیا یعنی انبیا علیہم السلام تو گناہ گار ٹھہرے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ کہا کہ وہ لوگوں کو (معاذ اللہ) شریعت کی لعنت سے آزاد کرانے کے لئے آئے تھے۔ نظام پاپائیت قائم کر کے پوپوں کو معصوم عن الخطا قرار دیا گیا اور انہی کے احکام شریعت قرار پائے۔ اگر حق کے مقابلے میں یہ سب باتیں دریا برد کئے جانے کے لائق ہیں تو قرآن کریم سے معارض ومتصادم مسلمانوں کی غیر مقدس تاریخی روایات بھی دیوار پر دے ماری ہوں گی۔ کتاب اللہ کے مقابلے میں ان تاریخی روایات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ یہ روایات اکثر بے سند اور بے سروپا ہوتی ہیں۔ اگر سند بھی ہو تو روایت کے راوی جھوٹے، ضعیف یا مجہول الحال ہوتے ہیں۔ اکثر وبیشتر ایسی روایات میں انقطاع ہوتا ہے یعنی درمیان سے راویوں کا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہوتا ہے، متصل نہیں ہوتا۔ پھر ان مٹھی بھر جھوٹی اور بے سروپا روایات کے مقابلے میں بے شمار تاریخی روایات اصحاب رسول ﷺ کی مدح کے مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے خلافِ قرآن نہیں۔ انہیں چھوڑ کر بیہودہ اور لغو تاریخی مواد پر گر پڑنا غلاظت پسند مکھی کی تقلید کرنا ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہود ونصاریٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام پر شرمناک بہتان لگائے ہیں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام پر (معاذ اللہ) شراب نوشی کا اور بحالتِ نشہ ننگے ہو جانے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق لکھا گیا ہے کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) انہوں نے اپنی دو حقیقی بیٹیوں سے بدکاری کی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ بہتان لگایا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے ہمسائے کی بیوی پر عاشق ہو گئے تھے اور اس سے بدکاری کی تھی وغیرہ وغیرہ دل آزار اور دلخراش خرافات اس نام نہاد مقدس لٹریچر میں موجود ہیں۔ ان نام نہاد مقدس تاریخی روایات سے جو نتائج یہود ونصاریٰ نے اخذ کئے ان کی ایک جھلک پروٹسٹنٹ پادری ولیم اسمتھ کی کتاب طریق الاولیا کے ان اقتباسات سے ملتی ہے جو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی مشہور زمانہ کتاب اظہار الحق کے اردو ترجمہ ''بائیبل سے قرآن تک'' کی تیسری جلد میں مذکور ہیں۔ پادری مذکور کی یہ کتاب مرزا پور میں ۱۸۴۸ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے چند اقتباسات بادل ناخواستہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ (۱۰۰)

(الف) افسوس صد ہزار افسوس کہ آدم سے توبہ کرنا ثابت نہیں اور مزید افسوس یہ کہ انہوں

نے کبھی ایک بار بھی اپنی خطا کی معافی کی درخواست نہیں کی۔

(ب) اس (لوط علیہ السلام) کی حالت پر سخت رونا آتا ہے ہم سخت افسوس کے ساتھ اپنے دلوں میں خوف اور خشیت لئے ہوئے (سبحان اللہ۔ظفر احمد) حیران ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو سدوم کی بستی کی تمام بدیوں اور گندگیوں سے پاک دامن رہا تھا اور اللہ کی راہ چلنے میں بڑا مضبوط تھا۔ اس شہر کی تمام نجاستوں سے ہزاروں کوس دور رہا تھا۔ مگر جنگل میں نکل جانے کے بعد (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ظفر) ایک دم بدی اور فسق کا اس پر اس قدر شدید غلبہ ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کون شخص ہے جو کسی شہر، جنگل یا غار میں محفوظ رہ سکتا ہے؟۔

(ج) اسحٰقؑ کا ایمان برباد ہو گیا کہ اس نے اپنی بیوی کو بہن بتایا۔ (استغفر اللہ)

(د) یعقوبؑ نے ایک ایسی بات کہی جو انتہائی کفر کی ہے کہ خدا کا ارادہ یہ تھا کہ میں شکار جلد حاصل کروں۔ اس معاملہ میں ہم یعقوبؑ کی حمایت میں کوئی بھی عذر خواہی کرنا پسند نہیں کرتے اور ہر شخص کو اس بات سے نفرت کرنی چاہئے اور ایسی حرکت سے گریز کرنا ضروری ہے۔

دیکھئے یہود و نصاریٰ حضرات انبیا علیہم السلام کی نبوت کا اقرار بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرنے والے مجہول الحال اور مجہول النسب لوگوں کے ان بہتانوں پر دل و جان سے ایمان رکھتے ہیں جو انہوں نے انبیا علیہم السلام پر لگا رکھے ہیں پھر ان سے من مانے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کی اس روش کو کچھ لوگوں نے یوں اپنا رکھا ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کی نبوت کا انکار نہیں کرتے لیکن ان پر بہتان لگانے والوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے مکروہ اور گھناؤنے نتائج از خود اخذ کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ کی صحابیت کا انکار نہیں کرتے لیکن حاطب اللیل، مجہول الحال کذاب و مفتری راویوں نے ان کے خلاف جو غلیظ مواد اگلا ہے، اسے چاٹنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس غلیظ تاریخی مواد پر مبنی جو تاثرات عوام الناس میں پھیلائے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جو تاثرات ادبی صلاحیتوں کی بنا پر زبردستی کشید کئے جاتے ہیں، وہ ان تاثرات سے چنداں مختلف نہیں جو پادری ولیم اسمتھ جیسے لوگوں نے اپنے زورِ قلم سے پیش کئے ہیں۔ کتاب اللہ سے سراسر اغماض کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کے متعلق پھیلائے گئے ان ناخوشگوار تاثرات کی جھلک کچھ یوں ہے :۔

(الف) گورنر کی حیثیت سے انہیں (امیر معاویہؓ کو) کوئی حق نہیں تھا کہ ٹھیٹھ جاہلیت کے طریق پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کی بجائے مدعی قصاص کے حوالے کر دیا جائے۔

(ب) ایک نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے

ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔

(ج) یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہؓ بن شعبہ) نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس امت محمدیہ ﷺ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔

(د) مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث معیارِ مطلوب کو برقرار نہ رکھ سکے۔

(ھ) حضرت عثمانؓ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا۔ غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔

(و) حضرت علیؓ کا ایک کام ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا چارہ نہیں۔

(ر) جن حضرات نے بھی قاتلین عثمانؓ سے بدلہ لینے کے لئے خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان کا یہ فعل شرعی حیثیت سے بھی درست نہ تھا اسے محض غلطی سمجھتا ہوں اس کو اجتہادی غلطی ماننے میں مجھے سخت تامل ہے۔

(ح) مگر نبی ﷺ کی صحبت وتربیت سے ان کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملا تھا کہ ان کے ذہن و سیرت کی پوری قلب ماہیت ہو جاتی۔

مذکورہ طرز کی عبارتوں کا پادری ولیم اسمتھ کی مذکورہ عبارتوں سے بغور تقابل کیجئے۔ جس طرح پادری صاحبان کو حضرت لوط علیہ السلام پر رونا آتا ہے اور وہ خدا کے ڈر سے لرزتے نظر آتے ہیں، حضرت اسحٰقؑ پر انہیں سخت افسوس ہوتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ سے وہ بے حد نالاں ہیں کہ ان کی حمایت میں کسی بھی عذر خواہی سے وہ معذور ہیں بعینہٖ ہمارے اسی ڈھب کے مسلمان بھائی بھی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ وغیرہ کے 'کارناموں' پر سخت افسردہ وغمزدہ ہیں۔ جیسے پادری صاحبان بزبانِ قال نہیں تو بزبانِ حال اپنے آپ کو معصوم عن الخطا، خدا کے خوف سے لرزاں وترساں متقی و پرہیزگار، محقق اور اعلیٰ پایہ کا ریسرچ سکالر ظاہر کر رہے ہیں کچھ یہی حال ہمارے قلم کاروں کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے پہلے نبوت کا سلسلہ جاری تھا اس لئے یہود ونصاریٰ کے شوخ قلم کا ہدف حضرات انبیاء علیہم السلام قرار پائے۔ رسول اکرم ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوا تو ہمارے کچھ بھائیوں کی ادبی صلاحیتیں حضرات صحابہ کرامؓ کے خلاف استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ یہود ونصاریٰ کے ہاں خدا کے بعد کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں اور ہمارے کچھ بھائیوں کے خیال میں خدا اور رسول کے بعد کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں۔

یہود و نصاریٰ اس غلیظ مواد سے دستبردار ہونے کو اس لئے تیار نہیں کہ اس سے وہ مقدس بائیبل میں موجود مبیّنہ مقدس تاریخی مواد سے محروم ہو جائیں گے اور ہمارے کچھ بھائی اپنے اس غلیظ تاریخی مواد سے اس کے غیر مقدس ہونے کے باوجود اس لئے دستبردار نہیں ہونا چاہتے کہ ایسا ہوا تو ہمیں یہ اعلان کرنا ہوگا کہ عہدِ رسالت سے آٹھویں صدی ہجری تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں۔ گویا ہمارے نزدیک ماٰخذ شریعت میں قرآن وسنت، اجماع اور قیاس کے بعد یہ غلیظ تاریخی مواد بھی شامل ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہے کہ ہماری ساری تاریخ اسی غلیظ مواد پر مشتمل ہے جس سے بدبودار تاثرات اخذ کر کے اپنے ہی قلب وذہن کو نجس کیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بروز قیامت یہ پوچھ لیا ''کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا تھا یَوْمَ لَا یُخْزِیُ اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْ مَعَہٗ (۱۰۱) ''یعنی قیامت کے دن اللہ اپنے نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے اس کے اصحاب کو رسوا نہیں کرے گا''۔ پس صحابہ کرامؓ کی عاقبت کا اچھا ہونا تو تمہیں قطعیت سے معلوم کرا دیا گیا تھا اس لئے تمہارے علم کے مطابق وہ معلوم العاقبۃ تھے اور خود تمہارا کیا انجام ہوگا، اس کی کوئی قطعی خبر ہم نے تمہیں نہیں دی تھی کہ مومنین کے لئے بشارتوں والی تمام آیات کے اولین مخاطب تم نہیں بلکہ اصحابِ رسول اللہ تھے۔ ہمیں تو تمہارے انجام کا علم تھا لیکن تم اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبۃ تھے۔ کسی بھی مجہول العاقبۃ کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اپنے انجام سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی بزعم خویش کرسیٔ عدالت پر براجمان ہو جائے اور معلوم العاقبۃ لوگوں یعنی میرے رسول کے اصحاب کے متعلق فیصلے صادر کرنے کی جسارت کرنے لگے کہ فلاں یوں تھا اور فلاں یوں تھا۔ اگر تم نے قرآن نہیں پڑھا تھا تو تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے ایسے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو جو خود تمہارے کہنے کے مطابق تنقید سے بالاتر نہ تھے۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم ان مؤرخین اور ان راویوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ؟''

خدانخواستہ ایسی بازپرس ہوگئی تو امید نہیں کہ کسی کو تاریخی کتب کے مؤلفین واقدی، طبری، ابن سعد اور غلیظ تاریخی مواد کے راویوں ابومخنف لوط بن یحییٰ، محمد بن سائب کلبی، عطیہ عوفی، ہشام بن محمد بن سائب کلبی وغیرہ وغیرہ کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور عقل سلیم عطا فرمائے۔ اللھم اغفرلنا ولا خواننا و حاسبنا حسابا یسرا.

جہاں تک کتب حدیث کا تعلق ہے تو اس طرح کی بعض روایات اول تو عموماً احادیث ہوتی ہی نہیں کیونکہ حدیث تو قول وفعلِ رسول ہے۔ صحابہ وتابعین کے اقوال واعمال پر حدیث کا اطلاق محض توسعاً یعنی حدیث کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے کر دیا جاتا ہے۔ پھر احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ اصحاب

رسول ﷺ کی مدح ومنقبت کے مضامین پر بھی تو مشتمل ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا گو ان احادیث اور اسی طرح کی تاریخی روایات کی حیثیت محض تائیدی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کو قرآن کریم کی نصوصِ قطعیہ نے بالکل واضح کر دیا ہے لہٰذا صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کو سمجھنا ان تائیدی روایات پر موقوف ہو کر نہیں رہ گیا۔ یہ مواد اس لئے قابل قبول ہے کہ کتاب اللہ کے عین مطابق ہے یا کم از کم کتاب اللہ کے کسی مضمون کے خلاف نہیں ہے۔ احادیث کا بڑا ذخیرہ ظنی روایات پر مبنی ہے کیونکہ یہ اخبار آحاد پر مشتمل ہے یہ روایات چند در چند راویوں کے ذریعے امت تک پہنچی ہیں۔ یہ ہم تک اس طرح نہیں پہنچیں جیسے قرآن کریم ہم تک تواتر سے پہنچا ہے۔ لہٰذا اگر خبر واحد بظاہر کتاب اللہ کے خلاف نظر آئے تو یہ دلیل ظنی کی دلیل قطعی سے تعارض واختلاف کی صورت ہوگی۔ اس تعارض کو دور کرنے کے لئے خبر واحد کو کتاب اللہ کے مطابق کیا جائے گا۔ بالفرض یہ تطبیق ممکن نہ ہو یا فریق مخالف غلط فہمی یا عناد اور ضد کی وجہ سے اسے قبول نہ کرتا ہو تو خبر واحد کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے گا اور صرف کتاب اللہ ہی کو لیا جائے گا۔

حدیث کے قرآن کریم سے بظاہر مُعارض ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں مہاجرین مکہ کو صادقون (سچے) قرار دیا ہے (۱۰۲) لیکن بعض احادیث میں بعض مہاجرین اصحاب نے اپنے نجی معاملات میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف ''کذب'' کی نسبت کی ہے۔ دیکھئے یہاں قرآن کریم کی خبر یقینی وقطعی ہے۔ حدیث ظنی ہے اس لئے ایسی ظنی خبروں کو قرآن کریم کے تابع کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ لفظ ''کَذَبَ'' بسا اقات بمعنیٰ ''غَلَطَ'' (اس نے غلط کہا یا غلطی کی) کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے یا غصے میں کسی نے دوسرے کو تغلیظاً (سخت لہجے میں) ایسا کہا ہے تو اس سے اصل حقیقت جو قرآن نے بیان فرمادی ہے کہ سب مہاجرین سچے ہیں، ہرگز ہرگز تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ہر کاذب یعنی جھوٹا غلط گو بھی ہوتا ہے لیکن ہر غلط گو کو کاذب نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کوئی انتہائی نیک شخص بھی غلط فہمی سے کوئی خلاف حقیقت بات کہہ دے تو اسے ہرگز جھوٹا نہیں کہا جا سکتا۔ مخلوقات میں سب سے اونچا مرتبہ رسول اکرم ﷺ کا ہے۔ آپ سے زیادہ سچا کون ہوسکتا ہے؟۔ حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں تھے کہ میں نے عبداللہ بن ابی (مشہور منافق) کو اپنے کانوں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو خرچہ وخیرات نہ دو یہاں تک کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور دیکھو انہیں اسی طرح چلنے دو، عزت والا ذلیل کو نکال دے گا یعنی ہم انہیں مدینہ سے نکال دیں گے۔ میں نے یہ بات اپنے چچا یا حضرت عمرؓ سے کہہ دی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہہ دی۔ آپ نے مجھے بلایا میں نے جو بات سنی تھی کہہ دی۔ پھر آپ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے

پاس آدمی بھیجا۔ انہوں نے حلف اٹھایا اور انکار کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ نے مجھے جھوٹا کیا اور ان کی بات کو سچ جانا۔ مجھے ایسا رنج ہوا کہ کبھی نہ ہوا تھا۔ میں اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔ میرے چچا نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تجھے جھوٹا قرار دیا اور تجھ پر ناراض ہوئے؟ اس وقت نبی کریم ﷺ نے مجھے بلایا اور مجھے وہ آیت (سورۂ منافقون) کی سنائی جو آپ پر نازل ہوئی تھی اور فرمایا اے زید! اللہ نے تیری تصدیق کی تو سچا ہے۔ (۱۰۳) دیکھئے رسول اکرم ﷺ تو معصوم عن الخطا اور مورِ دِ وحی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اصل حقیقت بتادی۔ صحابہ کرام معصوم عن الخطاء بھی نہیں اور مورِ دِ وحی بھی نہیں اور جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یہ احتمال بھی موجود ہے کہ غیر معصوم ہونے کی بنا پر غصے کی حالت میں انہوں نے دوسروں کے لئے سخت الفاظ استعمال کئے ہوں۔ اگر یہ تطبیق پسند نہیں تو قرآن کریم ہی کو لیجئے وہ تو سچا ہے۔ اسی طرح مثلاً علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبی ﷺ میں غزوات کے ضمن میں لکھا ہے کہ عرب اموالِ غنیمت پر بہت حریص تھے۔ قبول اسلام کے بعد بھی ایک عرصے تک ان میں یہ طمع باقی رہی حالانکہ قرآن کریم میں مہاجرین وانصار دونوں کی بے حد مدح کی گئی ہے اور سورۂ حشر میں بھی انصار مدینہ کے متعلق صاف بتایا گیا ہے کہ وہ شحّ (بخل) سے بچائے گئے ہیں (۱۰۴) جواب یہ ہے کہ اگر عربوں میں اخلاقی خرابیاں سرے سے نہ ہوتیں تو رسول اکرم ﷺ کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لوگ سال بسال اسلام قبول کرتے تھے اور رسول اکرم ﷺ ان کے اخلاق کو سنوارنے کا فریضہ بھی ساتھ ہی ساتھ سرانجام دیتے جاتے تھے۔ ان کے اخلاق سنور گئے تبھی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا ان کی مدح فرمائی ہے۔ کیا یہ اصحاب محمد ﷺ کی کرامت نہیں کہ اگر ان کی مدح ومنقبت پر مشتمل آیات میں کسی آیت کی فاسد تاویل کی جائے تو دوسری آیت اس کا بھانڈا پھوڑ دیتی ہے اگر دوسری میں فاسد تاویل کی جائے تو تیسری اس کا تعاقب کرتی ہے تیسری میں فاسد تاویل کی جائے تو چوتھی اس فاسد تاویل کو طشت از بام کئے دیتی ہے اگر چوتھی میں تاویل کی جائے تو پانچویں سدّ راہ بن جاتی ہے یونہی سلسلہ چلتا ہے اور بالآخر انصاف پسند کو حق قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ کتاب اللہ کی اس گرفت سے بچنے کا واحد اور آخری راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ کتاب اللہ کو (معاذ اللہ) محرّف ٹھہرا جائے اسی لئے تحریف قرآن پر ہزاروں جھوٹی روایات تیار کی گئیں تھیں جنہیں ''متواتر'' قرار دینے کی سعی نامشکور بھی کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ یہاں صرف تین مثالیں دی جاتی ہیں۔ سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم کی آیت ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ O (۱۰۵) یعنی اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت صاف صاف ظاہر کرتی ہے کہ جن لوگوں سے رسول اکرم ﷺ نے آخر تک نہایت مضبوط معاشرتی روابط قائم کئے رکھے وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے مثلاً خلفائے راشدینؓ سے آپ کے صھری (نکاح شادی) کے روابط ہیں۔ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مؤلفۃ القلوب کے گھر آپ نے اموال غنیمت سے بھر دیئے اور ہرگز ان پر کوئی سختی نہیں فرمائی۔ اس سے گھبرا کر کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ مذکورہ آیت میں (معاذ اللہ) تحریف ہوگئی ہے اصل آیت یوں تھی: **یاایھا النبی جاھد الکفار بالمنافقین** ''اے نبی منافقوں کے ذریعہ کفار کے خلاف جہاد کر'' (۱۰۶) حالانکہ یہ مضمون سراسر خلاف عقل ونقل ہے۔ منافق کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہوتی ہیں اسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ مسلمانوں کا کفار کے خلاف لڑائیوں میں ساتھ دے۔ قرآن کریم میں منافقین کی دھوکے بازی، مسلمانوں کے خلاف کفار کے لئے جاسوسی، ان کی بزدلی، مسلمانوں کے خلاف ان کے شدید قلبی بغض وغیرہ کو بخوبی واضح کیا گیا ہے (۱۰۷) سورۂ فرقان کی آیت ہے: **رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَاماً** O (۱۰۸) ''اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنادے''۔

آیت کے آخری حصے سے بخوبی واضح ہے کہ امامت اکتسابی نعمت ہے اور کسی خاص فرد، قوم اور نسل سے مخصوص نہیں اور نہ ہی بارہ یا چودہ یا اس سے کم وبیش متعین افراد تک محدود ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی کہا گیا کہ اس میں بھی (معاذ اللہ) تحریف ہوگئی ہے اصل آیت کا آخری حصہ یوں تھا: **واجعل لنا من المتقین اماماً** ''یعنی ہمارے لئے متقین میں سے کوئی امام مقرر فرمادے'' (۱/۱۰۹) حالانکہ یہ مفہوم خود امامیہ بھائیوں کے اپنے مسلمات کے خلاف ہے ان کے نزدیک اللہ پر لطف اور عدل واجب ہے اور کوئی زمانہ بقول ان کے حجت سے خالی نہیں رہتا اور یہ کہ حضرت مہدیؑ امام العصر ہیں گو غائب ہیں لیکن غائب ہونے سے ان کا موجود نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں لوگوں کو یہ دعا سکھانا کہ ہمارے لئے کوئی امام مقرر فرمادے قطعاً بے معنی اور تحصیل حاصل ہے۔ سورۂ نسا میں ہے: **يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ** .الأية. اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے جبکہ اولوا الامر (علما وحکام) کی مشروط اطاعت ہوگی اگر ان سے اہل علم کو اختلاف ونزاع ہو تو صرف اور صرف اللہ اور رسول (قرآن وسنت) کی طرف رجوع کا حکم ہے صاف معلوم ہوا کہ اولوا الامر معصوم عن الخطا نہیں۔ چونکہ ائمہ کرام اولوا الامر ہی میں شامل ہو سکتے ہیں اس لئے امامیہ حضرات نے آیت میں تحریف کا دعویٰ کر دیا

کہ اصل آیت (معاذ اللہ) یوں تھی: فان تنازعتم تناز عافی امر فردوہ الی اللہ والی الرسول والیٰ اولی الامر من کم. آیت میں بقول ان کے اللہ اور رسول کے علاوہ اولوالامر کی طرف بھی رجوع کرنے کا حکم تھا جبکہ اہلِ ایمان کا آپس میں کسی معاملے میں نزاع واقع ہو (۲/۱۰۹) بحمد اللہ تحریف لفظی کی اس طرح کی تمام روایات بالاتفاق جھوٹی قرار دی گئی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبے کو مجروح کرنے کے لئے جس طرح قرآن میں تحریفِ لفظی کی تمام مساعی دم توڑ گئی ہیں اسی طرح تحریف معنوی بھی نہ قرآن کریم کا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کے بلند پایہ مقام کو متاثر کرتی ہے۔

حدیث کی قرآن کریم سے تعارض کی ایک مثال یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے قریش مکہ مع حضرت ابوسفیانؓ اور ان کے خاندان کے قطعی مغفور ومرحوم ہیں اور ان کا جنتی ہونا قرآن سے ثابت ہے لیکن حضرت عمار بن یاسرؓ کے متعلق احادیث میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں فرمایا: تقتلک الفئة الباغية (۱۱۰) ''یعنی تجھے باغی گروہ قتل کرے گا'' اور بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ عمار انہیں جنت کی طرف بلاتا ہوگا اور وہ اسے آگ کی طرف بلاتے ہوں گے۔ اس سے یہ غلط استدلال کیا گیا کہ چونکہ جنگ صفین میں حضرت عمارؓ، حضرت علیؓ کی فوج میں تھے اور مشہور تاریخی روایات کے مطابق وہ اس جنگ میں شہید ہوگئے تھے اس لئے حضرت معاویہؓ اور ان کے سب ساتھی الفئۃ الباغیۃ (باغی گروہ) میں شامل ہیں بلکہ بعض نے مبالغہ کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جہنم کی طرف دعوت دینے والے گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھی (معاذ اللہ) مرتد اور کافر ہیں۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کی احادیث کا مصداق کسی بھی جانب کے صحابہ کرامؓ نہیں ہیں بلکہ وہ فتنہ جو اور شریر لوگ اس کا مصداق ہیں جو دونوں طرف شامل تھے۔ مثلاً تاریخی روایات کے مطابق شمر ذی الجوشن وہ اخبث الخبائث شخص ہے جو سانحۂ کربلا کا سب سے بڑا شیطانی کردار ہے یہی شمر جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل تھا (۱۱۱) یا مثلاً عمرو بن جرموز جنگ جمل میں حضرت علیؓ کی فوج میں تھا اس نے حضرت زبیرؓ کو شہید کیا اور آپ کے سرِ مبارک کو لے کر حضرت علیؓ کے پاس بغرض انعام پہنچا اور ملاقات کا خواستگار ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ابن صفیہؓ (حضرت زبیرؓ) کے قاتل کو جہنم کی بشارت سنا دو اور اسے اپنے پاس آنے نہیں دیا (۱/۱۱۲) تو جس طرح شمر ذی الجوشن اور عمرو بن جرموز جیسے خبیث الفطرت لوگوں کی وجہ سے حضرت علیؓ اور آپ کے مخلص ساتھیوں پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا بعینہٖ اسی طرح حضرت معاویہؓ کی فوج میں شامل اسی قماش کے لوگوں کی وجہ سے آپ پر اور آپ کے مخلص ساتھیوں پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کے قتل کے متعلق تاریخی کتب مثلاً البدایۃ والنہایۃ میں مرقوم ہے کہ آپ کے دو قاتل

ابن جوی سکسکی اور ابو الفادیہ فزاری حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچے، یہ دونوں باہم جھگڑ رہے تھے کہ حضرت عمارؓ سے چھینے گئے لباس اور ہتھیاروں پر ان کا حق ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے انہیں فرمایا کہ تم دونوں آگ کے بارے میں جھگڑ رہے ہو یعنی تم دونوں قتلِ عمارؓ کی وجہ سے جہنمی ہو۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا تھا کہ ہم نے حضرت عمارؓ کو شہید نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے کیا ہے جو انہیں میدانِ جنگ میں کھینچ لائے ہیں۔ آپ کا اشارہ فتنہ جو لوگوں مثلاً قاتلین عثمانؓ اور ان کے کھلے ہمنواؤں کی جانب تھا جن کی وجہ سے ان جنگوں تک نوبت آ پہنچی تھی۔ آپ کا اشارہ ہرگز حضرت علیؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں کی طرف نہیں تھا۔ کسی بھی جماعت میں شامل خبیث لوگوں کی وجہ سے پوری جماعت یا گروہ کو ہرگز مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ اگر نماز باجماعت میں شامل کئی نمازی ریاکار ہوں تو ان کی وجہ سے مخلص لوگوں کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حضرت عمرو بن العاص نے بھی حضرت عمار بن یاسرؓ کے قاتل کو جہنم کی بشارت دی تھی (۱۱۲/۲) اور جو روایات خلافِ قرآن ہیں وہ قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔

جہاں تک حضرت معاویہؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں خصوصاً بعض صحابہ کرامؓ کے (معاذ اللہ) مرتد، منافق یا کافر ہونے کا دعویٰ ہے تو یہ درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

(۱) اگر حضرت معاویہؓ اور آپ کے مخلص ساتھی ٹھیک اس باغی جماعت میں شامل ہوتے جو لوگوں کو جہنم کی دعوت دے رہی تھی اور حضرت عمار بن یاسرؓ کی شہادت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوتا تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل جاتی۔ حضرت علیؓ ہرگز ہرگز جنگ بند نہ کرتے اور حکمین کے تقرر پر راضی نہ ہوتے خواہ ان پر کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ہوتا۔

(۲) بہت سے صحابہ کرامؓ ایسے بھی تھے جنہوں نے ان جنگوں میں حصہ نہیں لیا تھا اور کئی ایک نے حضرت علیؓ کی بیعت ہی نہیں کی تھی تو یہ حضرات باغی گروہ کا صاف صاف پتہ چل جانے پر ہرگز غیر جانبدار نہ رہتے بلکہ حضرت علیؓ کا کھلم کھلا ساتھ دیتے۔

(۳) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو حضرت علیؓ کی طرف سے حَکَم تھے یقیناً وہ حضرت عمارؓ کی شہادت کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کے حَکَم حضرت عمرو بن العاص پر الزام عائد کرتے اور ہرگز اس امر پر تیار نہ ہوتے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو معزول کر دیا جائے۔

(۴) حضرت علیؓ اپنے دور خلافت کے آخری دنوں میں حضرت معاویہؓ سے ہرگز صلح نہ کرتے (۱۱۳)۔

(۵) قرآن کریم میں سورۂ مائدہ کی آیت قتال مرتدین کی رو سے حضرت علیؓ یقیناً حضرت

معاویہؓ پر ایسے ہی غالب آتے جیسے آپ حقیقی باغیوں خوارج پر غالب آئے تھے۔ یہ خوارج بے مثال شجاعت کے باوجود شرمناک ہزیمت سے دوچار ہوئے تھے۔ اس آیت میں مرتد ہونے والوں کو یہ وعید سنائی گئی ہے کہ ان کے مقابلے میں اللہ کے مقرب بندوں کی جماعت ان پر غالب آئے گی۔ اس آیت کی وضاحت ''خلفائے راشدین'' کے عنوان کے تحت کی جا چکی ہے۔ یہاں فریقین حق پر تھے جیسا کہ آئندہ سطور میں وضاحت آ رہی ہے۔ حق کا حق سے کوئی ایسا مقابلہ نہیں ہوا کرتا کہ ایک فریق کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیا جائے۔

(۶) حضرت حسنؓ ہرگز ہرگز حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے امت مسلمہ کی قیادت اور منصب خلافت ان کے سپرد نہ کرتے۔ اس صلح کو ہرگز صلح حدیبہ سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ حدیبہ کی صلح میں رسول اکرم ﷺ نے ہرگز اسلامی ریاست کی سربراہی قریشِ مکہ کے سپرد نہیں کر دی تھی۔

(۷) اس صورت میں حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں جو جنگی مہمات ہوئیں انہیں ہرگز جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ صحابہ کرامؓ ان جنگوں میں مثلاً جنگ قسطنطنیہ میں ہرگز ہرگز شریک نہ ہوتے یاد رہے کہ اس جنگ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ میزبانِ رسول بھی شریک ہوئے تھے اور انہی دنوں وہیں ان کا انتقال ہوا اور بموجب وصیت وہیں مدفون ہوئے نیز مؤرخین نے اس جنگ میں حضرت حسینؓ کے شریک ہونے کو بھی تسلیم کیا ہے (۱۱۴)

(۸) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس صورت میں قرآن کریم کی ان تمام آیات کے مضمون کو (معاذ اللہ) جھوٹا قرار دینا ہوگا جن میں فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مؤلفۃ القلوب کے مغفور ومرحوم ہونے کی ایسی محکم خبریں دی ہیں جن میں کسی طرح کے ابہام، اشتباہ کا گزر تک نہیں یعنی یہ قرآنی نصوص قطعی الدلالۃ ہیں۔

(۹) جب اہلِ شام یعنی حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے ایک گشتی مراسلے میں خود حضرت علیؓ نے مومن قرار دیا ہے تو دوسروں کو حضرت علیؓ کے خلاف رائے زنی کا حق ہی کب حاصل ہے؟ جنگ صفین کے بعد آپ نے اپنے علاقے کے شہروں میں جو مراسلہ ارسال فرمایا تھا اس کا مضمون ''نہج البلاغۃ'' کے مطابق یوں ہے کہ ہمارا اور اہل شام کا مقابلہ ہوا حالانکہ ظاہر ہے کہ ہمارا خدا ایک ہے نبی ایک ہے اور دعوت فی الاسلام ایک ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کے متعلق نہ ہم ان سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ہم سے کوئی مزید مطالبہ کرتے ہیں سوائے اس کے کہ حضرت عثمانؓ کے خون کے معاملے میں ہمارا اختلاف ہے اور ہم اس (خون ناحق) سے بری ہیں۔ (۱۱۵)

(۱۰) سورۂ حجرات میں ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں جنگ ہو جائے تو ان میں صلح کرادیا کرو کیونکہ مومنین باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ باہم جنگ کی وجہ سے مسلمان دائرۂ اسلام ہی سے خارج نہیں ہو جاتے۔ نیز رسول اکرم ﷺ نے اپنے نواسے سیدنا حضرت حسنؓ کے متعلق فرمایا تھا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرادے اس حدیث کا مضمون قرآنی مدلول کے تقاضوں سے عین ہم آہنگ ہے لہٰذا قبول کیا جائے گا۔

سیدنا حضرت علیؓ نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں اپنے خلاف لڑنے والوں کو تاریخی روایات کے مطابق اگر واقعی باغی قرار دیا ہے تو چونکہ حضرت علیؓ کا مقام و مرتبہ ان سے بہت بلند ہے لہٰذا انہیں اپنے ان مخالفین کو تغلیظاً (سخت لہجے میں) باغی کہنے کا حق حاصل تھا۔ دوسروں کو، خصوصاً جن کا زمانہ بھی متاخر ہے، ہرگز انہیں باغی کہنے کا حق حاصل نہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو داڑھی اور سر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اس سے دوسروں کے لئے ایسے رویہ کا جواز حاصل نہیں ہو جاتا۔ جن لوگوں نے بھی حضرت معاویہؓ کو باغی قرار دیا ہے ان سے تسامح سرزد ہوا ہے اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ اسے اگر مان بھی لیا جائے تو بھی حضرت علیؓ اور ان کے بعد حضرت حسنؓ سے ان کی مصالحت کے بعد تو انہیں ہرگز باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں دراصل اختلاف راجح اور مرجوح، اولیٰ (زیادہ بہتر صورت) اور خلافِ اولیٰ (کمتر صورت) کا ہے فریقین میں سے معاذ اللہ کوئی بھی باطل پر نہ تھا۔ ورنہ بتایا جائے کہ گوسالہ پرستی کرنے والے بنی اسرائیل کے معاملے میں انتظام و تدبیر کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے درمیان اختلاف بلکہ تلخ کلامی میں (معاذ اللہ) کون باطل پر تھا؟۔ غزوۂ بنونضیر میں رسول اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے کھجوروں کے باغات کاٹے جائیں لیکن بہت سے اصحابِ رسول ﷺ نے درخت نہیں کاٹے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کی کوئی مذمت نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں جماعتوں کی تصویب فرمائی کہ تم نے جو درخت کاٹے یا جنہیں تم نے نہیں کاٹا بلکہ ایسے ہی چھوڑ دیا تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا ہے۔ دیکھئے یہاں درخت کاٹنا اور نہ کاٹنا متضاد اعمال ہیں بظاہر ان میں سے ایک عمل ہی درست نظر آتا ہے بتایئے یہاں (معاذ اللہ) کون باطل پر تھا؟ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک قوم کی بکریاں کسی کے کھیت میں جا پڑیں اور اسے چر گئیں۔ چونکہ کھیتی کی قیمت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے وہ بکریاں کھیت والے کو دلا دیں لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے فریقین کے مفاد کے پیشِ نظر یہ فیصلہ دیا کہ کچھ عرصے کے لئے بکریاں کھیت

والے کو دی جائیں کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور بکریوں والے کھیت کاشت کریں۔ جب فصل حسبِ سابق ہو جائے تو کھیت والا اپنا کھیت واپس لے اور بکریوں والے اپنی بکریاں واپس لے لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ففھمنا ھا سلیمٰن ''کہ ہم نے یہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی غلط نہ تھا چنانچہ ارشاد ہے: وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا (۱۱۶) ''یعنی ہم نے (ان دونوں میں سے) ہر ایک کو حکم اور علم دیا تھا''۔

دیکھئے یہاں دونوں انبیاء علیہما السلام کا فیصلہ بظاہر مختلف ہے بتایئے ان میں (معاذ اللہ) باطل پر کون تھا؟ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ اجتہادی اختلاف بسا اوقات صواب وخطا کا نہیں بلکہ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ ہوتا ہے۔ اگر کبھی یہ اختلاف صواب وخطا کا بھی ہو تو بھی خطا والی جانب کو ہرگز باطل نہیں کہا جائے گا کسی رائے اور مسلک کے غلط ہونے اور باطل ہونے کے اس لطیف فرق کو سمجھا جائے۔ ہر باطل کام غلط بھی ہے لیکن ہر غلط کام یا رائے کو باطل نہیں کہا جاتا۔ صواب وخطا اور اولیٰ وخلافِ اولیٰ یعنی راجح و مرجوح کا یقینی فیصلہ بعض اوقات نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے یہیں سے اجتہادی اختلاف جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کا حضرت ہارونؑ سے انتظام وتدبیر کا اختلاف ہوا تو آپ نے یہ دعا فرمائی تھی: رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِکَ (۱۱۷) ''یعنی اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی دونوں کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما''۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین کامل ہوتا کہ خلافِ اولیٰ صورت ان کے بھائی حضرت ہارونؑ نے اختیار کی ہے تو وہ صرف اپنے بھائی کے لئے استغفادہ کرتے، اگر آپ کو یقینِ کامل ہوتا کہ خلافِ اولیٰ صورت آپ نے ہی اختیار کی ہے، تو آپ صرف اپنے لئے استغفار کرتے۔ استغفار میں اپنے بھائی کو شامل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہم دونوں میں خلافِ اولیٰ صورت اختیار کرنے کی خطا جس سے بھی ہوئی ہے، تو معاف فرمادے۔ جب بعض حالات میں اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا یقینی فیصلہ پیغمبروں کے بس میں بھی نہیں ہوتا تو صحابہ کرامؓ پر کیا اعتراض ہے؟۔ جن حضرات کے نزدیک حضرت معاویہؓ سے خطائے اجتہادی سرزد ہوئی ان کا یہ فیصلہ بھی یقینی وقطعی ہرگز نہیں بلکہ سراسر ظنی ہے۔ یہاں بہترین مسلک یہ ہے کہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیا جائے اور قطعاً کسی رائے کا بھی اظہار نہ کیا جائے کیونکہ صحابہ کرامؓ کا جنتی ہونا اور مغفور ومرحوم ہونا قرآنی محکمات سے ثابت ہے جبکہ ہمیں اپنی عاقبت کا یقینی علم حاصل نہیں تو ہم مجہول العاقبہ ہونے کی حیثیت سے معلوم العاقبہ لوگوں کے متعلق بزعم خویش کرسی انصاف پر بیٹھ کر کس طرح فیصلے صادر کر سکتے ہیں؟۔

کسی بھی قوم اور معاشرے کے انتظامی اداروں کی اولین ترجیح امن وامان کی برقراری یا بحالی ہوتی ہے جبکہ عدلیہ کی اولین ترجیح یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو انصاف مہیا کیا جائے خواہ ایسا کرنے سے کوئی بھی پہلوی یا مابعد اثرات (side-effects+post effects) مرتب ہوں۔ جب معاشرہ انتہائی پاکیزہ لوگوں پر مشتمل ہو تو انتظامیہ اور عدلیہ میں حدّ فاصل قائم کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی لیکن جب معاشرے میں جرائم پسند اور قانون شکن افراد بھی ہوں تو مہذب معاشروں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ انتظامیہ کو عدلیہ سے الگ رکھا جائے تاکہ انتظامی مصلحتوں کی آڑ میں لوگوں پر ظلم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود ایسے معاشرہ میں ناگزیر صورت حال کے پیش نظر انتظامیہ انصاف کے بعض تقاضوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور عدلیہ انصاف کے اعلیٰ تقاضوں کی مکمل اور بھرپور تکمیل سے نہ صرف قاصر رہتی ہے بلکہ ''قانون ضرورت'' وغیرہ کے تحت قانون کے بعض تقاضوں کے نظر انداز کرنے کو سند جواز عطا کرتی ہے اور کبھی ''وسیع تر مفاد عامہ'' جیسی اصطلاحات کی آڑ لی جاتی ہے پھر بھی عدلیہ اس صورتِ حال کو ''خلافِ عدل'' قرار نہیں دیتی۔ مثلاً کسی علاقے میں کوئی جرم سرزد ہو تو انتظامی ادارے مثلاً پولیس وغیرہ بہت سے لوگوں کو محض شبہ میں پکڑ لیتے ہیں۔ کئی کئی دنوں تک تفتیش کا عمل جاری رہتا ہے لیکن بعد میں یہ مشتبہ لوگ بے قصور ثابت ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ سالہا سال قید وبند رہتے ہیں بعد میں عدالتیں انہیں ''باعزت، بری کر دیتی ہیں۔ ان مظلوموں کو نہ صرف خود جسمانی و ذہنی اذیت ہوتی ہے اور ناحق محبوس رہنے کی وجہ سے ان کے معاشی مفادات سخت مجروح بلکہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ عزت نفس بھی پامال ہو جاتی ہے بلکہ بیوی بچوں، والدین و دیگر اقارب کو بھی سخت ذہنی اذیت، شرمندگی اور مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے بتایئے عدلیہ ان لوگوں کی کیا مدد کرتی ہے؟۔ اب دیکھئے خلفائے راشدین کی حکومت اور اس دور کے اسلامی معاشرے کی حالت عام معاشروں سے یکسر مختلف ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے پیچھے اپنے اصحاب پر مشتمل انتہائی پاکیزہ معاشرہ چھوڑا تھا جس کے تقدس کی شہادت قرآن کریم ہی نے نہیں بلکہ کتب سابقہ تورات اور انجیل نے بھی دی: ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (۱۱۸) ''یعنی ان (صحابہ کرامؓ) کی مثال تورات اور انجیل میں (بھی) ہے''۔ موجودہ بائیبل میں بھی ہے ''وہ (خداوند) کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا'' (۱۱۹) یہ دس ہزار قدسی وہی دس ہزار صحابہ کرامؓ ہیں جو فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تھے۔ فاران مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جیسا کہ بائیبل کی کتاب پیدائش کے اکیسویں باب سے واضح ہے جس میں حضرت اسماعیلؑ کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے ''اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا۔ اور تیر

انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی'' (۱۲۰) یہ بات یقینی ہے اور طبقاتی تواتر سے ثابت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور آپ کے عرب اصحاب کے جدامجد حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مکہ میں رہی ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ پروٹسٹنٹ چرچ کی موجودہ اردو بائیبل میں کتاب استثناء کے مذکورہ بالا حوالے میں دس ہزار قدسیوں کی بجائے لاکھوں قدسیوں کے الفاظ ہیں۔ یہ کھلی تحریف ہے اور (کنگ جیمس ورژن کی) انگریزی بائیبل میں اب بھی '' Ten Thousends of saints'' کے الفاظ ہیں۔

الغرض یہ خلافت راشدہ ایسا پاکیزہ معاشرہ تھا جہاں عدل وانصاف کے تقاضے کسی بھی صورت میں ہرگز مجروح نہیں ہوتے تھے۔ خلافتِ راشدہ رسول اکرم ﷺ کا وہ معجزہ ہے جو آپ کے وصال مبارک کے بعد کوئی تیس سال تک قائم رہا خود رسول اکرم ﷺ نے اس خلافتِ راشدہ کی مدت تیس برس بیان فرمائی ہے (۱۲۱)۔ ایسی خلافت کی مکمل نظیر قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور حضرت امام مہدیؓ کے دور میں تو ہوگی ورنہ کسی اور زمانے میں ہرگز نہیں ملتی۔ دورِ حاضر کے سیاستدانوں کے اس طرح کے بلند بانگ دعوے کہ وہ خلفائے راشدینؓ کا نظام لائیں گے نہ صرف جھوٹے ہیں بلکہ ان سے خلافتِ راشدہ کی توہین بھی ہوتی ہے کیونکہ خلافتِ راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے اور معجزہ غیر اختیاری ہوتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اچھے سے اچھا اسلامی نظام حکومت قائم ہوسکتا ہے لیکن ہرگز خلافتِ راشدہ علیٰ منہاج النبوۃ کے ہمسر نہیں ہوسکتا کیونکہ اس دور کے پاکیزہ اور مقدس لوگ آئندہ نہ ہوں گے اور نہ ہوسکتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے نہ شاہی دربار تھے، نہ دربان تھے، نہ شاہی محافظوں کی فوج ظفر موج تھی نہ وزراء اور مشیر دست بستہ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہوتے تھے وہ انتہائی سادہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انتظامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے، جہاد وقتال فی سبیل اللہ پر پوری نظر رکھنے کے باوجود اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے اور انتہائی متقی و پرہیزگار تھے۔ اس پاکیزہ دور میں قطعاً کوئی ایسی مثال نہ ملے گی کہ کسی خلیفۂ راشد نے محض شبہے کی بنا پر کسی پر تشدد کرایا ہو۔ انہوں نے عدل وانصاف کا پرچم حتی الوسع بلند رکھا۔ یوں عدل کے تقاضے بہرحال پورے کئے، گو اس میں انتظامی تقاضے کسی حد تک پامال ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ابولؤلؤ فیروز کی باتوں سے فوراً یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ شخص ان کا قاتل ہوگا۔ لوگوں نے کہا کہ اسے کیوں نہ پکڑا جائے تو آپ نے فرمایا کہ اس نے ابھی کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے کہ اسے پکڑ کر محبوس کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے اپنے قاتل عبدالرحمن بن ملجم کے متعلق پہلے ہی اندازہ فرمالیا تھا کہ یہ بدبخت آپ کو قتل کرے گا لیکن نام نہاد حفاظتی

نقطۂ نگاہ (Security point of view) کے تحت اسے قبل از وقت پکڑنے کی کسی کو اجازت نہ دی۔ آج اگر مثلاً امریکی صدر کے متعلق ذرا سا بھی خدشہ ہو کہ فلاں شخص صدر کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے تو حفاظتی تدبیر کے تحت اسے دھر لیا جائے گا۔

رسول اکرم ﷺ کے وصال مبارک کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا اس معجزہ یعنی خلافتِ راشدہ کے اثرات بھی بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں اور حضرت علیؓ کے پورے دور خلافت میں اسلامی معاشرے میں فتنہ جو لوگ بھی بڑی تعداد میں ظاہر ہو چکے تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں نے ہی پوری پوری کوشش فرمائی کہ عدل وانصاف کا جھنڈا سرنگوں نہ ہو۔ کسی پر ہرگز کوئی ظلم نہ ہونے پائے۔ جب فتنہ جو قاتلینِ عثمان نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر کھا تھا تو بھی آپ نے اپنے ہمدردوں کو سختی سے منع کئے رکھا کہ ان باغیوں کے خلاف جنگ نہ کی جائے آپ نے اپنی جان تو قربان کر دی لیکن یہ گوارا نہ فرمایا کہ اپنے ساتھیوں کو باغیوں کے مقابلے کی اجازت دیں صرف اس لئے کہ کسی بے گناہ پر ظلم نہ ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ کے اصحاب کا معاشرہ ایسا پاکیزہ تھا کہ اگر کسی سے اکا دکا کوئی جرم سرزد ہوتا تو یہ حضرات خوفِ خدا کے تحت خود ہی اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتے اور اپنے اوپر سزاؤں کا نفاذ کراتے تھے۔ یہاں اہل علم کے لئے حضرت ماعزؓ اور حضرت غامدہؓ کی مثالیں کافی ہیں (۱۲۲) لیکن حضرت علیؓ کے دور تک حالات کافی بدل چکے تھے اکثر اصحابِ رسول میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اس دور کے مجرم ایسا خوفِ خدا نہیں رکھتے تھے۔ کہ اپنے جرم کا خود اعتراف کریں، سچی گواہی دیں اور حقائق کو نہ چھپائیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مشتبہ لوگوں پر تشدد وغیرہ کے ذریعے جرم کا اعتراف کرایا جائے۔ حضرت نائلہ زوجۂ حضرت عثمانؓ قاتلین عثمانؓ میں سے کسی کو نہ پہچانتی تھیں حضرت علیؓ کے استفسار پر انہوں نے کہا تھا کہ میں محمد بن ابی بکر کے علاوہ کسی کو نہیں جانتی اور نہ ہی پہچانتی ہوں۔ جب حضرت علیؓ نے محمد بن ابی بکر سے باز پرس فرمائی تو اس نے بھی اصل قاتلوں سے لاعلمی ظاہر کی اور اپنے متعلق یہ کہا کہ میں گیا ضرور تھا لیکن حضرت عثمانؓ کے عار دلانے پر واپس آ گیا تھا۔ تاریخی کتب میں چند قاتلین کے جو نام مذکور ہیں اس سے قانونی تقاضے پورے نہیں ہوتے ان تاریخی بیانات کی حیثیت قانون کی نظر میں افواہوں (Hearsays) سے زیادہ نہیں۔ ادھر سیدنا حضرت علیؓ ہیں جن کے متعلق رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے واقضاھم علی (۱۲۳) ''یعنی لوگوں میں سب سے بڑا اور بہترین قاضی (انصاف سے فیصلہ کرنے والا) علی ہے''۔ جہاں تک حضرت علیؓ کی جانب سے محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی جیسے مشتبہ لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کا تعلق ہے تو اس طرح کے لوگوں سے ایسا سلوک انتظامی تقاضوں کے تو یکسر خلاف ہے لیکن قانونی تقاضوں سے یہ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ قانون کی نظر میں

کوئی بھی مشتبہ شخص نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک اس کے خلاف شبہہ حقیقت ثابت نہ ہو اور الزام ثابت نہ ہوجائے۔ یہ تھی سیدنا حضرت علیؓ کی مجبوری۔ ان حالات میں جبکہ امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ نہ دیا اور کئی ایک اصحاب مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ، اسامہ بن زیدؓ وغیرہ غیر جانبدار رہے، حضرت علیؓ کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ ملزمان کی انتظامی صلاحیتوں کو استعمال میں نہ لاتے اس لئے کہ وہ ملزم تو تھے لیکن قانونی تقاضوں کے مطابق مجرم نہ تھے۔ یہی حالات اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو پیش آتے تو یقیناً ان کا طرز عمل بھی وہی ہوتا جو حضرت علیؓ نے اختیار فرمایا۔ حضرت معاویہؓ و دیگر حضرات حضرت علیؓ کی بیعت کر بھی لیتے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ حضرت علیؓ کو محمد بن ابی بکر اور اشتر نخعی جیسے مشتبہ لوگوں کی بجائے انتظامی عہدوں کے لئے اچھی شہرت کے حامل حضرات مل جاتے۔ لیکن قاتلین عثمانؓ سے قصاص کے سلسلے میں ہرگز کوئی پیش رفت ممکن نہ تھی۔ حضرت علیؓ خلیفہ راشد ہونے کی حیثیت سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے تقاضوں پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی مشتبہ شخص یا ملزم پر نہ تو جسمانی یا ذہنی اذیت کے روادار ہوتے اور نہ ہی ایسے لوگوں کو محبوس کرتے تاکہ کسی بے گناہ پر محض شبہے پر ظلم نہ ہونے پائے۔ فتنہ جو لوگ ضمیر کی اس خلش سے محروم تھے جو بعض اوقات ایک مجرم کو از خود اعترافِ جرم کرنے پر آمادہ کردیتی ہے۔ یہاں یہ امر قطعاً خارج از بحث ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں سے کس فریق کا مؤقف آئینی اور کس کا غیر آئینی تھا۔ قدرت نے دونوں طرف کے ان فتنہ جو لوگوں کی تعزیر کا ایک متبادل انتظام کردیا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے مقتولین میں خاصی تعداد ان فتنہ جو لوگوں کی ہی تھی اسی لئے مقتولین کی مبینہ بڑی تعداد پر چنداں پریشان ہونے اور صحابہ کرامؓ کو بدنام کرنے کے لئے اسے اچھالنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان فتنوں میں بعض اصحابِ رسول ﷺ اور دیگر انتہائی نیک ومخلص لوگوں کو بھی تکلیف اٹھانی پڑی، قرآن کریم میں ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۱۲۴) ''یعنی (حتی المقدور) فتنے سے بچا کرو کیونکہ اس کا نقصان تم میں سے صرف ظالموں تک ہی مخصوص نہیں رہتا'' یہ چند لوگ اللہ کے نزدیک شہادت و دیگر اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے اس لئے ان کا ظاہری دنیوی نقصان دراصل نقصان ہے ہی نہیں، جنگ جمل میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہ اور جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسرؓ وغیرہ چند گنتی کے صحابہ کرامؓ ہی کا ذکر ملتا ہے جو مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے، حضرت علیؓ سے جب جنگ صفین کے مقتولین کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا تھا: قتلاهم وقتلانا في الجنة (۱۲۵) ''یعنی ان کے اور ہمارے مقتولین سب ہی جنت میں ہوں گے'' نیز آپ نے فرمایا: من قتل منّا و منهم يريد وجه الله تعالىٰ والدار الأخرة دخل الجنة (۱۲۶) ''یعنی ہماری اور ان کی جماعت سے جو بھی قتل ہوا وہ جنت میں داخل ہوگا جو اللہ کی رضا اور آخرت کا گھ

چاہتا تھا'' یوں حضرت علیؓ نے ان مخلص حضرات کو دونوں طرف کے فتنہ جو لوگوں سے الگ کر دیا۔

پھر ان بقیۃ السیف لوگوں پر بعد میں اللہ تعالیٰ نے حجاج بن یوسف اور ابن زیاد جیسے ظالم لوگ مسلط کر دیئے گو ان کے ظلم سے نیک لوگوں کو بھی تکالیف پہنچیں لیکن فتنہ جو بالخصوص ان کی زد میں آئے اور کیفرِ کردار کو پہنچے۔ جب کسی وجہ سے تشریعی قوانین کی گرفت میں مجرم اور فتنہ جو نہ آئیں تو تکوینی قوانین حرکت میں آجاتے ہیں اور یہی کچھ ہوا مثلاً قاتلین عثمانؓ اور قاتلین حسینؓ دنیا میں تھوڑی ہی مدت میں المناک انجام سے دوچار ہوئے۔ ان کا اخروی معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے معاف کرے۔

انتظام اور عدل وانصاف کے تقاضے جب باہم متصادم ہوں تو ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص یہ سمجھتا ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے لحاظ سے عدل وانصاف فی نفسہٖ راجح ہے اور انتظامی تقاضے مرجوح ہیں: اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۱۲۷) ''یعنی انصاف کرو کہ انصاف تقویٰ سے قریب تر ہے''۔ لیکن اگر ایسا کرنے سے انتظامی تقاضے بری طرح مجروح ہوں کہ امن وامان رخصت ہوتا نظر آئے یا لوگوں میں ذہنی خلجان اس طرح پیدا ہو کہ اس کا ازالہ ممکن نظر نہ آئے تو بظاہر تقویٰ کی حدود سے نیچے اترتے ہوئے فتویٰ کی حدود میں آنا اور بامر مجبوری انصاف کے بعض تقاضوں کو نظر انداز کرنا راجح ہو جائے گا اور اس طرز عمل کو خلافِ تقویٰ یا خلاف عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ نے عدل کو عینِ تقویٰ قرار نہیں دیا بلکہ اسے اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (تقویٰ سے قریب تر) فرمایا ہے۔ انتظامی تقاضوں کو راجح قرار دینے کی مثالیں خود رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے بھی ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اکرم ﷺ کی دلی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کی عمارت اسی طرح ہونی چاہئے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کی تھی۔ بعد میں قریش مکہ نے اس میں کچھ تغیر وتبدل کر دیا تھا لیکن فتح مکہ کے بعد بہت سے لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے خدشہ تھا کہ کہیں ان میں خلجان پیدا نہ ہو اور اوہام میں مبتلا نہ ہوں اس لئے آپ نے اپنے ارادے پر عمل نہیں فرمایا (۱۲۸) دیکھئے یہاں عدل کا تقاضا تو یہی تھا کہ اساسِ ابراہیمی پر خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کیا جائے لیکن پیش آمدہ انتظامی تقاضے کو جو فی نفسہ مرجوح اور خلافِ اولیٰ تھا، آپ نے اسے راجح اور اولیٰ کر دیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم ﷺ سے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت نہ دی کہ لوگوں میں بات پھیل جائے گی کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (۱۲۹)۔ دیکھئے فتنہ جو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی خلافِ اسلام سنگین سازشوں کی وجہ سے عدل کا تقاضا یہی تھا کہ اسے قتل کیا جائے لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہاں انتظامی تقاضے کو ترجیح دی کیونکہ منافقین پر سختی کرنے کا جو حکم آپ کو قرآن کریم میں دیا گیا ہے تو سختی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر حال میں انہیں قتل

ہی کیا جائے۔ جب مکہ مکرمہ اور حنین کی فتح ہوئی تو بعد میں رسول اکرم ﷺ نے بیشتر اموال غنیمت نومسلم قریش مکہ کو دیئے اور مہاجرین کو بہت کم بلکہ انصار کو کچھ بھی نہ دیا (۱۳۰!) دیکھئے انصاف کا بظاہر تقاضا یہ تھا کہ مال غنیمت انصار ومہاجرین کو بھی پورا دیا جاتا لیکن انتظامی تقاضا یہ تھا کہ دین اسلام کی اشاعت کی خاطر نو مسلموں کی تالیف قلب ہو۔ آپ نے اسی کو ترجیح دی۔

اب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے موقف کی طرف دوبارہ آیئے حضرت علیؓ کا خیال یہ تھا کہ قاتلین عثمانؓ کے بارے میں عدل وانصاف کے تقاضے ہرگز نظر انداز نہ ہوں۔ حضرت علیؓ انتہائی متقی اور پرہیز گار تھے دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے اس لئے انہوں نے سوچا کہ اگر امیر معاویہؓ ان کی بیعت کرلیں اور شرعی قصاص کا مقدمہ دائر کریں تو مجرم بھی ان کے ساتھ تعاون کریں گے اور جھوٹ بول کر اپنے جرم کی پردہ پوشی نہیں کریں گے۔ یوں حضرت علیؓ خلافتِ راشدہ کی خصوصیات خصوصاً عدل و انصاف کی برقراری کے لئے سخت کوشاں تھے۔ چونکہ ان کے اس مقصد کی تکمیل میں سراسر انتظامی سوچ کے حامل حضرت معاویہؓ کا موقف مانع ثابت ہو رہا تھا اسی لئے انہیں ان کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ حضرت علیؓ کی فوج کے لوگ بڑی تعداد میں یہ جو وقتاً فوقتاً کہا کرتے تھے کہ ہم سب قاتلین عثمانؓ ہیں تو اس طرح کی نعرہ بازی وہ اس لئے کرتے تھے کہ وہ بزعم خویش یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت معاویہؓ مطالبۂ قصاص کی آڑ میں حکومت واقتدار کے خواہاں ہیں ورنہ ان سب لوگوں کا بیک وقت قاتل عثمانؓ ہونا عقل ونقل کے خلاف ہے

ادھر حضرت معاویہؓ سراسر انتظامی ذہن کے مالک تھے۔ ان کے خیال میں امن وامان کی بحالی اولین ترجیح تھی جس کی ان کے خیال میں واحد صورت یہ تھی کہ جس پر قتل عثمانؓ میں شریک ہونے یا اس پر راضی ہونے کا ذرا سا بھی شبہ ہو اس پر بے دریغ ہاتھ ڈالنا چاہئے وہ اس مقصد کے لئے عدل وانصاف کے بے لچک پیمانوں اور تقاضوں کو نظر انداز کرنا وقت کی اہم ضرورت سمجھتے تھے اور اس امر کے قائل تھے کہ قتل عثمانؓ میں ملوث لوگوں اور ان کی کھلم کھلا حمنوائی کرنے والوں سے حضرت علیؓ عدل وانصاف کے بعض تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے خود قصاص لیں یا انہیں قصاص لینے کا موقع فراہم کرتے ہوئے راستے سے ہٹ جائیں لیکن '' اقضاھم علی '' کے مصداق سیدنا حضرت علیؓ کے لئے یہ قطعاً ممکن نہ تھا۔ اگر حضرت علیؓ فی الواقع قصاص لیتے تو امیر معاویہؓ ان کی بیعت سے انکار نہیں تھا اور نہ ہی وہ حضرت علیؓ کے خصوصی شرف وفضل اور اسلام میں آپ کے مقام ومرتبہ کے منکر تھے۔ الغرض قانون وانتظام کا یہ تصادم جنگ صفین کی صورت میں سامنے آیا۔ دونوں کا موقف بظاہر مختلف دکھائی دینے کے باوجود اپنی اپنی جگہ پر درست تھا کوئی بھی باطل پر نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے اختلاف کی

طرح یہ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا اختلاف تھا۔ اگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ دونوں مورِ دِ وحی نہ ہوتے تو ممکن تھا ان کا اختلاف بھی طول پکڑتا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ دونوں میں سے کوئی بھی صاحبِ وحی نہ تھا کہ خطا پر وحی کے ذریعہ مطلع ہوتا اور خلافِ اولیٰ کو بھی خطاء ہی کہا جاتا ہے فریقین اولیٰ کے تعین میں اپنے آپ کو حق بجانب گردانتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے موقف کو بھی اہمیت دی کیونکہ مخلص اور وفادار ساتھیوں کو چھوڑ کر ان کی فوج میں بے وفا اور دنیا دار لوگوں کی بھی کمی نہ تھی پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ عمرو بن جرموز اور شمر ذی الجوشن جیسے بد باطن لوگ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے، جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو بہتر طریقے سے پہچاننا شروع کر دیا تھا اور ان کی مذمت میں آپ کے خطبات نہج البلاغۃ وغیرہ کتب میں مذکور ہیں۔ نہج البلاغۃ یا اس طرح کی دوسری کتب کے وہ مضامین جو کتاب وسنت کے سراسر خلاف یا کتاب و سنت کے لازمی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں وہ قابل قبول نہیں ہو سکتے اور جو مضامین ایسے نہیں انہیں نہ صرف قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ الزامی طور پر ان کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ الغرض جنگ صفین کے بعد آپ کو اندازہ ہوا کہ لاتوں کے یہ بھوت باتوں سے ماننے والے نہیں چنانچہ آپ کی طرف یہ قول منسوب ہے'' تم امارت معاویہؓ کو برا نہ سمجھو اگر تم نے انہیں بھی کھو دیا تو تم سروں کو گردنوں سے حنظل کی طرح کٹ کر گرتے دیکھو گے'' (۱۳۱)

سیدنا حضرت حسنؓ کا بھی یہی موقف تھا اسی لئے انہوں نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے خلافت وامارت ان کے سپرد کر دی۔ خود حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان بھی بالآخر مصالحت ہو گئی تھی (۱۳۲) الغرض مذکورہ بالا حالات میں امیر معاویہؓ غالب آ جاتے تو وہ قتلِ عثمانؓ کے سلسلے میں لوگوں پر بے دریغ ہاتھ ڈالتے اور آٹے کے ساتھ گھن بھی یقیناً پس جاتا۔ حضرت علیؓ کا مکمل کنٹرول ہوتا تو فتنہ جو لوگوں کا استیصال قانونی تقاضوں کے تحت ممکن نہ ہوتا اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت دونوں کی مدد فرمائی کہ جنگ صفین میں لوگ اپنی مرضی اور ارادے سے باہم برسرِ پیکار ہوئے جس سے فتنہ جو لوگوں کی اکثریت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کسی طرح کے ظلم یا کوتاہی سے بھی محفوظ ہو گئے۔

اگر تاریخ وحدیث کی روایات کی قرآن کریم کے ساتھ تطبیق سے کسی کو بالفرض اطمینان نہ ہو تو اطمینان غیر اختیاری ہے جبکہ ایمان اختیاری ہے لہٰذا تاریخ وحدیث کو نظر انداز کر کے کتاب اللہ کی محکمات پر ایمان رکھنا ہوگا۔ صحابہ کرام اور خلفائے راشدینؓ کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے صحابہ کرامؓ کے خلاف مخالفین کے مطاعن اور ان کے جوابات کا فرداً فرداً تذکرہ قطعاً غیر ضروری ہے اگر مطاعن جھوٹے

ہیں تو خارج از بحث ہوئے اگر بالغرض سچے ہیں تو چونکہ اصحاب رسول کا مغفور ومرحوم ہونا قطعیت سے ثابت ہو چکا لہٰذا یہ کالعدم ہیں۔ کیونکہ ان مطاعین کا کتاب اللہ سے تعارض ہوتا ہو تو ایسے مطاعن کو صحیح سمجھنا محض فریب نفس ہے۔ اگر یہ کتاب اللہ سے مُعارض نہ ہوں تو قرآنِ کریم سے ثابت ہو چکا کہ صحابہؓ کے تمام صغائر وکبائر معاف کر دیئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں بروزِ قیامت رسوانہیں کرے گا۔ واللہ یھدی من یشآء الیٰ صراط مستقیم۔

(۹) مشاجراتِ صحابہؓ کے لحاظ سے فرقے:

(الف) خوارج:

اسلام میں یہ سب سے پہلا فرقہ ہے جو حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ظاہر ہوا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمروؓ بن العاص کو حَکَم (فیصل) مقرر کیا گیا تھا۔ اس تحکیم (فیصل مقرر کرنے) پر حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک گروہ اچانک بگڑ گیا اور اس نے نعرہ بلند کیا ان الحکم الا للہ یعنی فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ ان کے خیال میں انسانوں کو حَکَم بنانا کفر تھا یہی لوگ خوارج کہلائے۔ یہ حضرت علیؓ کے لشکر سے علیحدہ ہو گئے اور کھلم کھلا مخالفت بلکہ خونریزی اور فتنہ وفساد پر اتر آئے ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ نے حکمین کا تقرر کر کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ بھی حضرت علیؓ کے خلاف جنگ جمل میں شریک ہونے کی وجہ سے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہوئے۔ خوارج کا عقیدہ تھا کہ جو شخص گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو اور توبہ نہ کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور کافروں کے خلاف مسلح جہاد فرض ہے۔ جو شخص ان خوارج کا ہم عقیدہ نہ ہوتا اسے وہ بلا جھجک قتل کر ڈالتے تھے۔ یوں انہوں نے کشت وخون اور فتنہ وفساد کا دروازہ کھول دیا۔ سیدنا حضرت علیؓ نے انہیں قتل وغارت سے بارہا منع فرمایا لیکن وہ باز نہ آئے تو بالآخر آپ نے ان کے خلاف مجبوراً قتال کیا۔ جنگ میں خوارج کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کے بہت سے لوگ مقتول ہوئے۔ خوارج اپنے مسلک میں نہایت متشدد تھے اور عام مسلمانوں سے الگ تھلگ تھے۔ غیر خارجی مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کے مال واسباب کو لوٹ لینا نہ صرف جائز بلکہ ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ بعد میں خوارج مزید کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک فرقہ اباضیہ کہلاتا ہے جو عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔ اس فرقے کے لوگ غیر خارجی مسلمانوں کو نہ مشرک کہتے ہیں اور نہ ہی

انہیں مومن مانتے ہیں تاہم وہ غیر خارجی مسلمانوں کا خون بہانا حرام قرار دیتے ہیں۔ غیر خارجی مسلمانوں کی گواہی کو قبول کرتے ہیں اور ان سے نکاح وو راثت کے تعلقات قائم کرنا درست سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ فرقہ خوارج کے دیگر فرقوں کی نسبت معتدل ہے یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے بعض اطراف مثلاً عمان میں اس فرقے کے لوگ اب تک موجود ہیں (۱۳۳)

(ب) شیعہ:

حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی باہمی آویزش میں ان کے حامی بالترتیب شیعانِ علیؓ اور شیعانِ معاویہؓ کہلاتے تھے۔ شیعہ کا لغوی معنیٰ ''گروہ اور جماعت'' کا ہے حضرت علیؓ کا امیر معاویہؓ سے اختلاف محض انتظامی وسیاسی نوعیت کا تھا۔ دونوں حضرات اس پر متفق تھے کہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا سخت مؤاخذہ ومحاسبہ ہو لیکن حضرت علیؓ قصاص لینے سے قبل اپنی خلافت کے استحکام پر زور دیتے تھے کہ خلافت کے مستحکم ہونے اور امن وامان کے بحال ہونے پر ہی قصاص جیسے سنگین مسئلے کی طرف کما حقہ متوجہ ہونا ممکن ہے جبکہ حضرت معاویہؓ قاتلین سے فوری قصاص چاہتے تھے اس میں تاخیر کے بالکل روادار نہ تھے اسی اختلاف کی وجہ سے امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں (شیعانِ معاویہؓ) نے حضرت علیؓ کی بیعت نہ کی۔ شیعانِ علیؓ اور شیعانِ معاویہؓ میں دین کے اصول وفروع میں کوئی حقیقی اختلاف نہ تھا اور نہ ہی ان کی اذانیں اور نمازیں ایک دوسرے سے الگ الگ نوعیت کی تھیں۔ رسول اکرم ﷺ کے کچھ اصحاب مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ اس تنازعے میں غیر جانبدار رہے جبکہ بعض دیگر اصحاب دونوں جانب موجود تھے حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے اپنے حقیقی بھائی حضرت عقیلؓ بن ابی طالب امیر معاویہؓ کے حامیوں میں شامل تھے۔ شیعانِ علیؓ میں بھی حضور اکرم ﷺ کے بعض بلند پایہ اصحاب مثلاً حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ وغیرہ شامل تھے۔ تاہم شیعانِ علیؓ میں جو لوگ صحابیِ رسول نہیں تھے ان میں سے بعض لوگ عبداللہ بن سبا کے نظریات سے کم وبیش متاثر تھے۔ عبداللہ بن سبا یہودی تھا لیکن بظاہر مسلمان ہو کر مسلمانوں میں اعتقادی اور فکری بگاڑ پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہا۔ مؤرخین نے اس شخص کی فتنہ انگیزی کے حالات لکھے ہیں اسے اس لئے بھی فرضی شخصیت قرار نہیں دیا جاسکتا کہ شیعہ حضرات کی اسماء الرجال کی کتب مثلاً ''تنقیح المقال مؤلفہ عبداللہ مامقانی'' میں اس کے تفصیلی احوال مذکور ہیں۔ اس کے بعض پیروکار حضرت علیؓ کی محبت میں اس قدر غلو کرتے تھے کہ وہ آپ کی الوہیت (خدائی) کے معتقد ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے انہیں سمجھایا

اور منع فرمایا جب یہ باز نہ آئے تو انہیں کڑی سزائیں دیں اور غلو پر اصرار کرنے والوں کو قتل کیا۔ یہ گروہ ''سبائیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی طرح کا ایک اور غالی (غلو پسند) گروہ ''غرابیہ'' تھا۔ اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کو وحی دے کر حضرت علیؓ کے پاس بھیجا تھا مگر ان سے غلطی ہوگئی کہ وحی حضرت محمد ﷺ کو پہنچادی کیونکہ بقول ان کے حضرت علیؓ اور حضرت محمد ﷺ شکل وصورت میں ایک دوسرے کے ایسے مشابہ تھے جیسے ایک غُراب (کوا) دوسرے غُراب کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس صُوری مشابہت کی وجہ سے حضرت جبرائیلؑ بقول ان کے دونوں میں امتیاز نہ کر سکے۔ شیعہ کے اندر اور بھی بہت سے فرقے ابھرے ہر ایک کے عقائد ونظریات الگ الگ تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت فرقہ امامیہ نے پائی۔ اس فرقے کی مشہور ترین شاخ اثنا عشریہ ہے جو بارہ ائمہ کی امامت کی قائل ہے۔ ان ائمہ کرام کے اسمائے گرامی مع دیگر کوائف کے درج ذیل ہیں :۔(۱۳۴)

(۱)	حضرت علی المرتضیٰؓ کنیت ابوالحسن	وفات ۴۰ ہجری	دفن نجف اشرف	عمر ۶۳ سال
(۲)	حضرت امام حسنؓ کنیت ابومحمد	وفات ۴۹ ہجری	دفن مدینہ منورہ	عمر ۴۷ سال
(۳)	حضرت امام حسینؓ کنیت ابوعبداللہ	وفات ۶۱ ہجری	دفن کربلا	عمر ۵۷ سال
(۴)	حضرت امام زین العابدینؒ کنیت ابومحمد	وفات ۹۵ ہجری	دفن مدینہ منورہ	عمر ۵۷ سال
(۵)	حضرت امام محمد باقر کنیت ابوجعفر	وفات ۱۱۴ ہجری	دفن مدینہ منورہ	عمر ۵۷ سال
(۶)	حضرت امام جعفر صادق کنیت ابوعبداللہ	وفات ۱۴۷ ہجری	دفن مدینہ منورہ	عمر ۶۵ سال
(۷)	حضرت امام موسیٰ کاظم کنیت ابومحمد	وفات ۱۶۳ ہجری	دفن بغداد	عمر ۵۵ سال
(۸)	حضرت امام علی رضا کنیت ابوالحسن	وفات ۲۰۳ ہجری	دفن طوس	عمر ۵۵ سال
(۹)	حضرت امام جواد (تقی) کنیت ابوجعفر	وفات ۲۲۰ ہجری	دفن بغداد	عمر ۲۵ سال
(۱۰)	حضرت امام ھادی (نقی) کنیت ابوالحسن	وفات ۲۵۴ ہجری	دفن ایران	عمر ۴۲ سال
(۱۱)	حضرت امام حسن عسکری کنیت ابومحمد	وفات ۲۶۰ ہجری	سرّ من رأی	عمر ۲۸ سال

(۱۲) حضرت امام مہدی مبینہ ولادت ۲۵۶ ہجری بقول اثنا عشری شیعہ غار سرّ من رأی میں پوشیدہ اور زندہ موجود ہیں جن کے ظہور کا انتظار ہے انہیں امام منتظر اور قائم آل محمد بھی کہتے ہیں۔

پہلے، آٹھویں اور دسویں امام کی کنیت ابوالحسن ہے۔ دوسرے چوتھے ساتویں اور گیارہویں امام کی کنیت ابومحمد ہے تیسرے اور چھٹے امام کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ پانچویں اور نویں امام کی کنیت ابوجعفر ہے۔ ان میں خلیفہ اور حکمران تین ہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ چھ سال کے قریب خلیفہ رہے۔ حضرت حسنؓ کی

خلافت تقریباً چھ ماہ رہی اور امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ امام مہدیؒ قیامت کے قریب خلیفہ ہوں گے۔ تاہم اثنا عشری حضرات ان ائمہ کو حقیقی ائمہ اور خلفاء تصور کرتے ہیں اور انہی کو حکومت کا صحیح مستحق گردانتے ہیں۔ امام کے متعلق امامیہ کے چیدہ چیدہ عقائد یہ ہیں :۔

(۱) امام معصوم عن الخطاء ہوتا ہے اس لئے وہ مفترض الطاعۃ بھی ہے یعنی ہر حال میں اس کی اطاعت فرض ہے۔

(۲) امام کا رتبہ نبوت سے بڑھ کر ہے امام منصوص من اللہ (اللہ کی طرف سے نامزد) ہوتا ہے

(۳) امامت صرف آل علیؓ کا حق ہے

شیعہ امامیہ میں زیادہ تعداد اثنا عشریہ کی ہے اس کے مقابلے میں امامیہ کی ایک اور شاخ اسمٰعیلیہ ہے جنہیں باطنیہ اور قرامطہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسمٰعیلیہ فرقے نے آہستہ آہستہ سیاسی قوت حاصل کر کے ایک مضبوط فاطمی سلطنت قائم کی تھی۔ بعد میں یہ فرقہ بھی کئی شاخوں میں بٹ گیا جن میں ایک شاخ خوجہ کہلاتی ہے اور دوسری بوہرہ۔ ان شاخوں کے مراکز دنیا بھر میں قائم ہیں اور ہر ایک کا الگ الگ نظام اور مذہبی ڈھانچہ ہے اثنا عشریہ اور اسماعیلیہ چھٹے امام حضرت امام جعفر صادقؒ کی امامت تک متفق ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ نے اپنے بڑے بیٹے اسماعیلؒ کو اپنا جانشین اور ساتواں امام مقرر فرمایا تھا لیکن پھر امام جعفر صادقؒ نے انہیں معزول کر کے اپنے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظمؒ کو ساتواں امام مقرر فرمایا۔ اس پر شیعوں میں اختلاف پیدا ہو گیا چونکہ شیعہ عقیدہ کے مطابق امام معصوم عن الخطا ہوتا ہے اور ساتھ ہی منصوص من اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نامزد اور مقرر کردہ ہوتا ہے لہٰذا ان میں سے ایک گروہ الگ ہو گیا کہ حضرت اسماعیلؒ کو معزول نہیں کیا جا سکتا اور ان کی معزولی کی کہانی ہی غلط ہے یہی گروہ اسمٰعیلیہ کہلایا ان کے ہاں امامت کا سلسلہ جاری ہے جبکہ اثنا عشریہ کے خیال میں گیارہویں امام حضرت حسن عسکریؒ کے صاحبزادے حضرت مہدیؒ بارہویں امام پر سلسلۂ امامت ختم ہو جاتا ہے جو بقول اثنا عشریہ بچپن میں ہی روپوش ہو گئے تھے پہلے پہل چند خاص لوگوں کی ان تک رسائی تھی ان کا یہ زمانہ ''غیبتِ صُغریٰ'' کہلاتا ہے بعد میں ان کا ظاہری رابطہ بقول اثنا عشریہ لوگوں سے بالکل منقطع ہو گیا۔ یہ زمانہ ''غیبتِ کبریٰ'' کا دور کہلاتا ہے جو تا حال چل رہا ہے وہ بقول اثنا عشری شیعہ قیامت کے قریب اپنے آپ کو ظاہر کریں گے۔ غیبت کبریٰ کے زمانے میں حکومت کا حق شیعہ کے بیان کردہ ''نظریہ ولایتِ فقیہہ'' کے تحت جید اہل علم کو حاصل ہو گا جن کی حیثیت بارہویں امام کے نائب کی ہے۔

شیعہ میں فرقہ زیدیہ حضرت زید شہیدؒ کی طرف منسوب ہے جو حضرت زین العابدینؒ کے

صاحبزادے ہیں۔ آپ نے اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں خروج کیا تھا اس میں آپ مقتول ہوئے اور کوفہ میں سولی پر لٹکائے گئے۔ زیدیہ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کسی کا نام لے کر خلیفہ یا امام مقرر فرمایا تھا بلکہ آپ نے کچھ ایسے اوصاف بیان فرمادئے تھے جن کا امام میں پایا جانا ضروری ہے اور یہ اوصاف آپ کے بعد حضرت علیؓ میں موجود تھے لیکن حالات کے تقاضے کے تحت حضرت علیؓ نے اصحاب ثلٰثہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کو تسلیم کرلیا تھا اور ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا لہٰذا مفضول (کم فضیلت والے) کی امامت بھی جائز ہے اگرچہ افضل کا حق زیادہ ہے۔ زیدیہ صحابہ کرامؓ کا احترام کرتے ہیں یوں یہ فرقہ اہل سنت سے بہت قریب ہے۔ تاہم بعد میں جب یہ فرقہ کمزور پڑ گیا اور دوسرے شیعہ فرقے اس پر غالب آگئے تو زیدیہ مفضول کی امامت کے نظریہ سے پھر گئے اور ان لوگوں میں شامل ہوگئے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ جو شیعہ فرقے بعض اصحابِ رسول کو چھوڑ کر باقی اصحاب سے تبرّا (بیزاری) کا اظہار کرتے ہیں انہیں ان کے مخالفین یعنی اہلِ سنت ''روافض'' کہتے ہیں۔

شیعہ میں اعتقادی تبدیلیاں بتدریج واقع ہوتی رہیں۔ متقدمین شیعہ رسول اکرم ﷺ کے اصحاب کا احترام کرتے تھے انہیں صرف اس بنا پر شیعہ کہا جاتا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتے تھے۔ ان کے خیال میں جنگوں میں حضرت علیؓ یقیناً حق پر تھے جبکہ ان کے مخالفین خطا پر تھے (۱۳۵)، صحابہ کا احترام نہ کرنے والوں کو رافضی کہا جاتا تھا جس کی جمع ''روافض'' ہے یا ان کے لئے ایسے الفاظ اسماء الرجال کی کتب میں مذکور ہیں جن سے انہیں معتدل شیعہ سے الگ کیا جاتا ہے۔

(ج) اہل السنۃ والجماعۃ:

یہ امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا گروہ (سوادِ اعظم) ہے انہیں مختصراً اہل سنت اور سنی بھی کہا جاتا ہے اہل سنت اصحابِ رسول ﷺ، اہلِ بیت رسول ﷺ اور آل رسول ﷺ سب کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ کسی کو بھی معصوم عن الخطاء قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک عقل ونقل کی رو سے عصمت صرف حضرات انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے۔ صحابہ کرامؓ معصوم عن الخطاء نہ ہونے کے باوجود سب کے سب قرآن کریم کی رو سے مغفور ومرحوم اور قطعی جنتی ہیں لہٰذا ان کی عاقبت ہمیں معلوم ہے، یعنی وہ ہمارے لئے معلوم العاقبۃ ہیں۔ جو لوگ صحابیِ رسول نہیں لوگوں کے پاس ان کی عاقبت کا کوئی یقینی وقطعی علم نہیں ہے۔ علّام الغیوب اللہ تعالیٰ ہی کو ان کی عاقبت کا یقینی علم ہے۔ لہٰذا لوگوں کے علم کے اعتبار سے جو صحابی نہیں وہ

مجہول العاقبۃ ہیں لوگوں کا ان کے متعلق علم ظنی ہے قطعی نہیں۔ اہل سنت کے خیال میں مجہول العاقبۃ لوگوں کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بزعم خویش کرسیٔ عدالت پر براجمان ہوکر معلوم العاقبۃ اصحابِ رسول کے حقیقی یا مفروضہ جرائم کی فہرست مرتب کرتے پھریں اور ان کی عاقبت کے متعلق خود ساختہ اور خانہ ساز فیصلے صادر کریں۔ رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد چاروں خلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی اسداللہ الغالب رضی اللہ عنھم اجمعین کو اہلِ سنت خلفائے راشدینؓ قرار دیتے ہیں اور ان کی خلافتِ راشدہ کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے اولین مخاطب حضرات صحابہ کرامؓ ہیں جنہیں قرآن کریم میں اسلام کے غالب آنے اور کفر کے مغلوب ہونے کی بشارتیں بار بار دی گئی ہیں لہٰذا اہل سنت کے نزدیک یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد معاذ اللہ اہل باطل غالب آئیں اور اہل حق مغلوب ہوکر رہ جائیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت اہل سنت کے خیال میں سیدنا حضرت حسینؓ کی شہادت کی طرح مظلومانہ شہادت ہے۔ باغیوں نے نہ تو حرمت والے مہینوں کا خیال کیا نہ مدینہ منورہ کی حرمت کو ملحوظ رکھا اور نہ ہی حضرت عثمانؓ کے بلند مقام و مرتبہ اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی قرابت کا کوئی خیال کیا۔ شہادتِ عثمانؓ پر اہلِ سنت کے نزدیک حضرت علیؓ کا یہ موقف زیادہ درست (اولیٰ) تھا کہ خلافت کے استحکام اور امن عامہ کی بحالی وقیام کے بعد باغیوں سے قصاص لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں جن لوگوں نے خلوص نیت کے ساتھ حضرت علیؓ سے اختلاف کیا اور قاتلین عثمانؓ سے فوری قصاص لینے کا مطالبہ کیا وہ گو باطل پر نہ تھے لیکن ان کا مطالبہ خلافِ اولیٰ تھا یوں وہ خطائے اجتہادی کے مرتکب ہوئے کسی بھی صحابیٔ رسول سے بدگمانی کا جواز اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب اصحابِ رسول کے متعلق اعلان فرمادیا ہے کہ اللہ نبی کو اور نبی پر ایمان لانے والے اصحاب نبی کو بروز قیامت رسوا نہیں کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو معاف فرمادے گا۔ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو صحابہ کرامؓ خصوصاً مہاجرین وانصار کے لئے استغفار کا حکم دیا ہے۔ اس حکم کی تعمیل امت کا سوادِ اعظم ہمیشہ سے کرتا چلا آیا ہے۔ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کے لئے استغفار کی تعلیم دے اور پھر اسے قبول نہ فرمائے۔ خود رسول اکرم ﷺ کو بھی اپنے اصحاب کے لئے استغفار کا حکم تھا (۱۳۶) ملائکہ بھی ان کے لئے استغفار کرتے تھے (۱۳۷) لہٰذا اہل سنت کے نزدیک اصحابِ رسول کے مغفور ومرحوم ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ اگر ان میں دنیا میں باہم جھگڑے ہوئے اور غلط فہمیاں ہوئیں تو اگر ان غلط فہمیوں یا رنجشوں کا بالفرض دنیا میں پوری طرح ازالہ نہ ہوا ہو تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل جنت میں صلح کرادے گا (۱۳۸) اور صلح تبھی ہوتی ہے جب

واقعی تھوڑی یا زیادہ رنجش موجود ہو ورنہ صلح کرانا تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے بے معنیٰ ہوگا اللہ کا کلام ایسے عیب سے پاک ہے۔ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ مظلوم جماعت کا ساتھ دیں۔ جنگ کے باوجود ظالم اور باغی جماعت اسلام سے خارج نہیں ہو جاتی (۱۳۹)، اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں کا حکومت کے خلاف خروج نہ بھی ہو اور وہ باہم لڑ پڑیں تو بھی قرآنی حکم کے مطابق حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ مظلوم جماعت کا ساتھ دے اور زیادتی کرنے والی جماعت کے خلاف مظلوم جماعت اور گروہ کی حمایت میں حسبِ ضرورت جنگ کرے۔ اس صورت میں زیادتی کرنے والا گروہ لازماً حکومت کے خلاف بھی نبرد آزما ہوگا اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی جنگ اپنی حکومت کے خلاف ہو یا وہ باہم جنگ کریں کسی بھی صورت میں کوئی بھی جماعت اسلام سے خارج نہیں ہو جاتی۔ یاد رہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت محاربہ کا اطلاق ہر طرح کے باغیوں پر نہیں ہوتا، اس آیت کی رو سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے کاٹے جائیں یا انہیں جلاوطن کیا جائے، اس آیت سے اہل علم نے قطاع الطریق یعنی رہزن اور ڈاکو مراد لئے ہیں اور کتب فقہ میں قطاع الطریق (رھزنوں) کی سزا کا ذکر حدود کے بیان میں اسی آیت کے تحت کیا جاتا ہے جبکہ باغیوں کے لئے الگ عنوان قائم کیا جاتا ہے، البتہ اگر باغیوں کا حکومت سے کوئی نظری یا فکری اختلاف نہیں بلکہ محض لوٹ مار مقصود ہو اور ان لوگوں نے پرامن لوگوں کو لوٹنا مشغلہ بنالیا ہو تو ان کا حکم بھی قطاع الطریق کا ہوگا۔ حضرت علیؓ کے خلاف جنہوں نے حقیقۃً بغاوت کی اور جن کا باطل پر ہونا شک وشبہہ سے بالاتر ہے وہ خوارج ہیں۔ خوارج نے حضرت علیؓ سے جنگ نہروان میں بری طرح شکست کھائی لیکن بقیۃ السیف خوارج پر آپ نے آیتِ محاربہ والی حد قائم نہیں فرمائی، لہٰذا حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق ایسے شبہات باطل ہیں۔

اہل سنت کا صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ استدلال بھی ہے کہ اصحاب رسول میں جو لوگ (معاذ اللہ) منافق تھے یا بعد میں مرتد ہونے والے تھے تو کیا رسول اکرم ﷺ کو بھی ان کا علم تھا یا نہیں تھا؟ اگر علم تھا تو منافقین کے متعلق سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم میں رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اے نبی! کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کیجئے اور ان پر سختی بھی کیجئے ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے (۱۴۰) تو آپ نے کیوں ان کے گھر اموال غنیمت سے بھر دئے؟ کیوں انہیں امان دی؟ انہیں کیوں اپنا کاتب وحی مقرر کیا؟ کیوں انہیں اپنے مکاتیب اور مراسلوں کا کاتب مقرر فرمایا؟ کیوں شادی بیاہ کے ذریعے ان سے قریبی روابط استوار فرمائے۔ کیوں انہیں اہم ذمہ داریاں سونپیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر آپ کو علم نہیں تھا تو معاذ اللہ الزام اللہ

تعالیٰ پر آ جائے گا کہ اس نے اپنے رسول کو مخاطب کر کے منافقین و کفار پر سختی کرنے کا حکم تو دے ڈالا لیکن اپنے رسول کو بتایا بھی نہیں کہ کون منافق ہے اور کون نہیں؟ یہ بتایا ہی نہیں کہ جن لوگوں سے آپ نہایت قریبی روابط اور رشتے ناطے قائم کر رہے ہیں یہ وہ بعد میں (معاذ اللہ) مرتد ہو جائیں گے۔ مہاجرین وانصار کو نظر انداز کر کے (غزوہ حنین و ہوازن کے بعد) جن مؤلفۃ القلوب نومسلم قریش مکہ کے گھر آپ اموال غنیمت سے بھر رہے ہیں تو وہ بعد میں (معاذ اللہ) اسلام سے پھر جائیں گے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اکرم ﷺ کو اس طرح کے لوگوں کا کوئی علم نہ تھا تو دوسروں کو یہ علم کہاں سے حاصل ہو گیا؟۔

اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرامؓ ہی نے قرآن وسنت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کیا یعنی یہ حضرات ''ناقلین'' ہیں اور قرآن وسنت منقول ہیں اگر ناقلین یعنی صحابہ کرامؓ کو ناقابل اعتماد ٹھہرایا جائے تو (معاذ اللہ) قران وسنت ناقابل اعتماد ٹھہریں گے اسی لئے سب صحابہؓ عدول یعنی معتبر ہیں کہ دین کے سلسلے میں وہ اللہ اور رسول کی طرف جو بھی منسوب کریں اس میں جھوٹ اور خیانت کے وہ ہرگز مرتکب نہیں ہوتے وہ کبائر سے بچتے ہیں۔ اگر دلائل کی بنا پر کسی صحابی کی کوئی خطا یا غلطی معلوم بھی ہو جائے کہ وہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں تو اس غلطی میں صحابی کا اتباع نہیں کیا جائے گا لیکن عدم اتباع سے عدم احترام لازم نہیں آتا۔

اہلِ سنت اثنا عشری حضرات کے ائمہ کرامؒ کو انتہائی قابل احترام سمجھتے ہیں لیکن انہیں منصوص من اللہ، معصوم عن الخطا اور مفترض الطاعہ نیز نبیوں سے افضل قرار نہیں دیتے بلکہ صحابہ کرامؓ سے بھی وہ ان ائمہ یا کسی بھی اور بزرگ کو افضل قرار نہیں دیتے، بارہویں امام حضرت مہدیؒ کے متعلق اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ قیامت کے قریب پیدا ہوں گے اور حضرت حسنؓ کی اولاد سے ہوں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے دنیا پر نزول سے پہلے مسلمانوں کے امام اور سربراہ ہوں گے، اہلِ سنت کے نزدیک سادات کرام میں صرف گیارہ یا بارہ بزرگ ہی نہیں بلکہ لاتعداد بلند پایہ اہل علم اور بزرگ ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں، اہل سنت کے نزدیک ان تمام ائمہ کرام کا مسلک وہی تھا جو اہلِ سنت کا ہے ان کی طرف لوگوں نے بہت سی غلط اور مبالغہ آمیز باتیں منسوب کر رکھی ہیں تحریف قرآن، تقیّہ، مُتعہ، بدا مسئلہ طینت اور رجعت وغیرہ وغیرہ کی باتیں اہل سنت کے نزدیک ان ائمہ کرام پر بہتان ہیں۔

اہل سنت کے نزدیک کسی معیّن شخص پر لعنت کرنا تب جائز ہے جبکہ اس کا کفر پر مرنا قطعی ویقینی ذرائع سے ثابت ہو مثلاً ابلیس، فرعون، ہامان وغیرہ کا کفر وشرک پر تادم مرگ قائم ودائم رہنا قرآن کریم سے ثابت ہے اور قرآن کریم کی خبر یقینی وقطعی ہوا کرتی ہے جبکہ اس کی اپنے معنیٰ پر دلالت بھی یقینی ہو۔ اسی طرح قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط وغیرہ جن کا کفر پر قائم رہنا قرآن کریم سے ثابت ہے، ان پر

بھی لعنت جائز ہے واجب ہرگز نہیں چہ جائیکہ اس کے لئے خاص اہتمام والتزام بھی کیا جائے۔ جس شخص کا کفر وشرک پر مرنا یقینی وقطعی ذریعہ یعنی قرآن کریم اور خبر متواتر سے ثابت نہ ہو اسے معین ومخصوص کر کے لعنت کرنا جمہور اہل سنت کے نزدیک جائز نہیں البتہ دنیا میں لوگوں کے ظاہری حالات کا اعتبار کرتے ہوئے ان کے متعلق رائے قائم کی جائے گی جو گو ظنی ہوگی لیکن دنیوی امور میں ظن پر عمل ہوگا اور ظن کو معتبر سمجھا جائے گا۔ اگر کسی خاص شخص کو معیّن ومقرر نہ کیا جائے بلکہ عام الفاظ میں برے کاموں میں مبتلا لوگوں پر کسی اہتمام اور ارالتزام و پابندی کے بغیر لعنت کی جائے مثلاً لعنۃ اللہ علی الکاذبین، جھوٹوں پر لعنت، ظالموں پر لعنت وغیرہ کہا جائے تو درست ہے کہ اس سے کوئی اشتعال لوگوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اہلِ سنت کے نزدیک مثلاً حضرت عمرؓ کے قاتل پر نام لے کر لعنت کرنا یا حضرت عثمانؓ کے قاتلین پر نام لے کر لعنت کرنا درست نہیں بلکہ جن لوگوں کا کفر اور شرک پر مرنا قطعی یقینی ذرائع سے بھی ثابت ہو لیکن کچھ لوگ ان کے معتقد ہوں تو بھی انہیں مخصوص ومعین کر کے لعنت کرنا درست نہیں کہ اس سے بھی اشتعال پیدا ہوگا۔ مثلاً کسی قوم کو فرعون سے عقیدت ہو تو فرعون کو مخصوص کر کے لعنت کرنے سے اس کے معتقدین مشتعل ہوں گے۔ اسی لئے قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کے بتوں کو برا نہ کہو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری اس حرکت پر جواباً اللہ کو گالی دینے لگیں (۱۴۱) اسلام تبلیغی دین ہے اور لوگوں کو ناحق مشتعل کرنا آدابِ تبلیغ کے منافی ہے۔ اسلام صلح وآشتی اور امن وامان کا دین ہے۔ فتنہ وفساد اور اشتعال انگیزی اسلام میں سخت مذموم ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے کاموں کا قیاس بندوں کے افعال واعمال پر کرنا درست نہیں۔ ممکن ہے ایک کام اللہ کے لئے کمال ہو اور لوگوں کے لئے وہی کام سراسر عیب ہو مثلاً اپنی بڑائی جتلانا (تکبر) اللہ کے لئے درست ہے کیونکہ تکبر اسی کی صفت ہے وہی متکبر ہے لیکن مخلوق کے لئے تکبر سخت عیب ہے اسی طرح عین ممکن ہے کہ کوئی کام اللہ کے لئے نقص نہ ہو لیکن مخلوق کے لئے نقص ہو مثلاً اضلال (گمراہ کرنا) اللہ کے لئے اس معنیٰ میں کوئی عیب نہیں کہ اسی نے اسبابِ ہدایت اور اسباب ضلال پیدا فرمائے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں ہے: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ ○ (۱۴۲) 'یعنی اللہ جسے گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں'۔

لیکن اگر مخلوق لوگوں کو گمراہ کرے تو یہ اس کے لئے سخت عیب ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا گروہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی مہم چلائے اور دلیل یہ دے کہ کسی کو گمراہ کرنا کوئی عیب نہیں اللہ تعالیٰ بھی تو لوگوں کو گمراہ کرتا ہے لہٰذا اگر ہم بھی کسی کو گمراہ کرنے کی مہم چلائے ہوئے ہیں تو ہم پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ اگر یہ استدلال غلط اور فریب نفس ہے تو بعینہٖ اسی طرح کسی کو معیّن کر کے لعنت کرنے کا یہ جواز بھی قطعاً غلط ہے کہ

اللہ تعالیٰ بھی تو کچھ لوگوں پر لعنت کرتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک بندوں کا دوسروں پر ایسی لعنت کرنا ایسے ہی مذموم اور قابلِ گرفت ہے جیسے دوسروں کو گمراہ کرنا جرم ہے اسی معنیٰ میں وہ لعنت کو سب وشتم میں ہی شمار کرتے ہیں کسی کو مخصوص کر کے عام گالی دینا اتنا اشتعال انگیز نہیں ہوتا جتنا کسی کو لعنت کرنا عموماً اشتعال انگیز ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں کفار اور مرتدین کے متعلق جو آتا ہے کہ ان پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں (۱۴۳) تو اس سے کسی کو مخصوص کئے بغیر عام لعنت مراد ہے جیسے یوں کہا جائے کافروں پر لعنت، ظالموں پر لعنت، جھوٹوں پر لعنت یا جیسے کسی خاص یہودی یا عیسائی کو مخصوص کئے بغیر رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا یعنی شرک میں مبتلا ہو گئے۔ (۱۴۴) یا مثلاً آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا ہے دونوں پر لعنت کرے یعنی جبکہ یہ حلالہ طے شدہ منصوبے کے تحت ہو۔ کسی خاص شخص کو معیّن کر کے لعنت کرنا اول تو رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہی نہیں اگر بالفرض ہو بھی تو آپ تو مورد وحی ہیں آپ کو جو علم دیا جاتا ہے اس میں خطاء کا احتمال ہی نہیں۔ دوسروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو معیّن ومخصوص کر کے لعنت کریں۔

اہلِ سنت کے نزدیک مسئلہ خلافت اصولِ دین میں سے نہیں ہے۔ خلیفہ کا سب سے افضل ہونا ضروری نہیں اور نہ ہی ہر دور میں کسی کے ہر لحاظ سے دوسروں سے افضل ہونے کا کوئی متفق علیہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے خلیفہ منصوص من اللہ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد کوئی شخص معصوم عن الخطاء ہے خلیفہ کا انتخاب اہل الرائے حضرات (ارباب حل وعقد) کریں گے خلفائے راشدینؓ کے دور میں مہاجرین وانصار صحابہ کرامؓ کو اربابِ حل وعقد سمجھا جاتا تھا۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کے انتخاب یا اس کے تعیّن کا طریقہ اتنا اہم نہیں جتنی اہم یہ بات ہے کہ خلیفہ لوگوں پر کس طرح احکام الٰہی کا نفاذ کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص زبردستی حکومت وامارت پر قابض ہو جائے لیکن وہ لوگوں کی صحیح رہنمائی کرتا ہو اور شریعت کا نفاذ کرے وہ ایسے شخص سے کہیں بہتر ہے جسے گو لوگوں نے منتخب کیا ہو لیکن خود بھی فاسق وفاجر ہو اور نفاذ شریعت کے خلاف ہو یا تساہل سے کام لیتا ہو اور مخلص نہ ہو۔

جو لوگ سیدنا حضرت علیؓ کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہؓ کا تو احترام کرتے ہیں لیکن حضرت علیؓ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی معاذ اللہ تنقیص کرتے ہیں۔ یزید کو ''خلیفۂ راشد'' اور سیدنا حضرت حسینؓ کو معاذ اللہ باغی قرار دیتے ہیں انہیں نواصب کہا جاتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیل نواصب بھی خوارج اور روافض کی طرح افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ اہل سنت حضرت علیؓ کو حضرت معاویہؓ سے کہیں زیادہ

افضل گردانتے ہیں کیونکہ حضرت علیؓ کا تعلق سابقون اوّلون سے ہے نیز آپ عشرہ مُبشّرہ میں شامل ہیں یعنی ان دس صحابہ میں شامل ہیں جن کا نام لے کر رسول اکرم ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی ویسے بھی قرآن کریم کی رو سے ان اصحاب کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور جہاد کیا تھا۔ جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا ان کا مرتبہ پہلے سے اسلام قبول کرنے والوں سے فروتر ہے اگر چہ اللہ نے بھلائی کا وعدہ ہر ایک سے کر رکھا ہے (۱۴۵) چونکہ ایسی قرآنی بشارتیں نہایت وزنی ہیں اور احادیث صحیحہ سے بھی صحابہ کرامؓ کا انتہائی مقدس و محترم ہونا معنوی تواتر سے ثابت ہے اس لئے اہل سنت صحابہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے اور نہ ہی کسی پر تنقید کے روادار ہیں۔ جو شخص اصحابِ رسول اللہ ﷺ کی مفروضہ یا حقیقی کوتاہیوں کے معلوم کرنے اور بیان کرنے میں جتنی دلچسپی لیتا ہے اسی تناسب سے وہ اہل سنت سے الگ تھلگ ہے۔

یزید، ابن زیاد اور عمرو ذی الجوشن جیسے لوگوں کے خلاف تاریخی مواد موجود ہے یہ لوگ صحابی نہیں، تاریخی روایات ظنّی ہیں ان سے ہر ہر بات کا یقینِ قطعی حاصل نہیں ہوتا گو مجموعی تاثر اچھا نہیں ابھرتا لہٰذا اہلِ سنت احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ان لوگوں کا ذکر وہ اس انداز سے نہیں کرتے جس سے ان کی تعظیم یا اکرام ثابت ہو نہ ہی ان کا نام لے کر ان پر لعن طعن کرتے ہیں تاہم یہ جمہور اہلِ سنت کا مسلک ہے، البتہ اہل سنت بالاتفاق ان تمام لوگوں سے قطعی بیزاری ظاہر کرتے ہیں جو رسول اکرم ﷺ کے اصحاب، آپ کے اہل بیت اور آپ کی آل کے دشمن ہوں اور انہیں توبہ کی توفیق حاصل نہ ہوئی ہو یا انہیں اللہ تعالیٰ نے معاف نہ فرمایا ہو، اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کسی خاص شخص یا گروہ کے متعلق اللہ اور اس کے رسول نے یہ خبر دی ہو کہ ان کا انجام اچھا نہ ہوگا اور یہ خبر یقینی قطعی ذرائع سے لوگوں تک منتقل ہوئی ہو تو یہ شخص یا گروہ خواہ بظاہر کتنے ہی اچھے کام کرتا نظر آئے، ان کا انجام یقیناً اچھا نہ ہوگا مثلاً خوارج دین کے کاموں مثلاً تلاوت قرآن اور شب بیداری وغیرہ میں بظاہر بڑی سبقت لینے والے دکھائی دیتے تھے بایں ہمہ گمراہ ہیں۔ اگر کسی خاص شخص یا گروہ کے مغفور ومرحوم ہونے کی اطلاع اللہ اور اس کے رسول نے دی ہو اور یہ خبر قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہو تو ایسے لوگ بظاہر کتنے ہی خلاف شرع کام کرتے کیوں نہ نظر آئیں ان کا انجام بہر حال اچھا ہوگا مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کیا، اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک آئے، اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے جھوٹ بولا، اپنی اس حرکت سے انہیں بیحد رنجیدہ کیا کہ ان کی بینائی تک شدتِ غم سے متاثر ہوئی ان برادرانِ یوسفؑ کے متعلق یہ تمام قرآنی خبریں ہیں لہٰذا یقیناً سچی ہیں جبکہ قدحِ صحابہ کی خبریں ظنی بلکہ جھوٹی ہیں، اگر

حضرت یعقوب علیہ السلام کی دعا اور استغفار سے تمام برادرانِ یوسفؑ مغفور ومرحوم ہیں تو صحابہ کرامؓ کے متعلق رسول اکرم ﷺ کے بارہا استغفار اور دیگر قرآنی شہادتوں کی وجہ سے وہ بھی یقیناً مغفور ومرحوم ہیں،

حوالہ جات

۱۔ سورۃ البقرہ۔۱۴۳
۲۔ سورۃ ال عمران۔۹۷
۳۔ سورۃ البقرہ۔۱۳
۴۔ سورۃ التوبۃ۔۷۳
۵۔ سورۃ التحریم۔۹
۶۔ سورۃ التوبۃ۔۱۰۱
۷۔ سورۃ ال عمران۔۱۷۹
۸۔ سورۃ التوبۃ۔۶۴
۹۔ سورۃ التوبۃ۔۸۴
۱۰۔ سورۃ الاحزاب۔۶۰
۱۱۔ سورۃ الفرقان۔۵۳
۱۲۔ سورۃ النحل۔۴۱
۱۳۔ سورۃ ال عمران۔۱۹۵
۱۴۔ سورۃ المائدہ۔۵۴
۱۵۔ سورۃ محمد۔۲۲
۱۶۔ سورۃ البقرۃ۔۶۴
۱۷۔ سورۃ ایضاً۔۸۳
۱۸۔ سورۃ المائدہ۔۹۲
۱۹۔ سورۃ التوبۃ۔۳
۲۰۔ سورۃ یونس۔۷۲
۲۱۔ سورۃ الفتح۔۱۶
۲۲۔ سورۃ التغابن۔۱۲
۲۳۔ سورۃ محمد۔۲۹،۳۰
۲۴۔ ایضاً۔۳۵
۲۵۔ سورۃ ال عمران۔۱۴۴
۲۶۔ سورۃ المائدہ۔۵۴
۲۷۔ سورۃ التوبۃ۔۹۵
۲۸۔ سورۃ النسا۔۶۳
۲۹۔ سورۃ الانعام۔۱۰۶
۳۰۔ سورۃ الاحزاب۔۴۸
۳۱۔ سورۃ البقرہ۔۱۰۴
۳۲۔ مختصر تفسیر ابن کثیر اختصار وتحقیق محمد علی لصابونی، دارالقرآن الکریم بیروت (لبنان) جلد دوم صفحہ ۱۵۶
۳۳۔ سورۃ ال عمران۔۱۵۹
۳۴۔ ایضاً۔۱۵۲
۳۵۔ سورۃ الاحزاب۔۴۸
۳۶۔ سورۃ ال عمران۔۱۱۹
۳۷۔ سورۃ التوبۃ۔۸۴
۳۸۔ سورۃ الکہف۔۲۸
۳۹۔ سورۃ الدھر۔۴۴
۴۰۔ البدایۃ والنھایۃ حافظ ابن کثیر دارالحدیث قاہرہ، طبع اول ۱۹۹۲ء جلد ۴، صفحات ۱۰۶، ۱۰۷
۴۱۔ سورۃ النجم۔۳،۴
۴۲۔ سورۃ التوبۃ۔۱۲۷
۴۳۔ سورۃ النور۔۶۳

۴۴۔ سورۃ النسا۔۱۴۲

۴۵۔ سورۃ التوبۃ۔۴۵تا۴۷

۴۶ ایضاً۔۵۶،۵۷

۴۷ سورۃ الاحزاب۔۱۸،۲۰

۴۸۔ سورۃ المنافقون۔۴،۵

۴۹۔ ایضاً۔۷

۵۰۔ سورۃ التوبۃ۔۶۷

۵۱۔ شرح نہج البلاغۃ ابن میثم بحرانی بحوالہ تحفہ اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ص۴۹۷

۵۲۔ سورۃ البقرہ۔۱۳۷

۵۳۔ سورۃ المطففین۔۳۳

۵۴۔ سورۃ التوبۃ۔۶۶

۵۵۔ سورۃ الاحزاب۔۲۴

۵۶۔ سورۃ الفتح۔۱۴

۵۷۔ سورۃ الحجرات۔۱۴

۵۸۔ سورۃ التوبۃ۔۱۰۲

۵۹۔ سورۃ ایضاً۔۱۱۷

۶۰۔ سورۃ بنی اسرائیل۔۱۰۰

۶۱/۱۔ سورۃ ھود۔۱۱۴

۶۱/۲۔ البدایۃ والنہایۃ،۳/۲۷۶

۶۲/۱۔ سورۃ التوبۃ۔۹۶

۶۲/۲۔ سورۃ البقرہ۔۲۱۸

۶۲/۳۔ سورۃ ال عمران۔۱۷۱

۶۳۔ سورۃ الحدید۔۱۹

۶۴/۱۔ مختصر تفسیر ابن کثیرؒ جلد سوم، صفحات ۳۴۵، ۳۴۶، تفسیر ابی السعودؒ۔ دارالتراث العربی بیروت (لبنان) جلد۸، صفحہ۱۱۰

۶۴/۲۔ سورۃ البقرہ۔۲۸۶

۶۵۔ سورۃ التحریم۔۸

۶۶۔ سورۃ التوبہ۔۱۰۳

۶۷۔ مختصر تفسیر ابن کثیرؒ، جلد۳، صفحات ۱۰۹، ۱۱۰

۶۸۔ سورۃ التوبۃ۔۱۰۰

۶۹۔ سورۃ النسا۔۱۱۵

۷۰۔ سورۃ المائدہ۔۷۳

۷۱۔ سورۃ ال عمران۔۱۷۲

۷۲۔ سورۃ الاحزاب۔۷۲

۷۳/۱۔ سورۃ یوسف۔۱۱۰

۷۳/۲۔ سورۃ ہود۔۷۴

۷۴۔ سورۃ لقمان۔۱۵

۷۵۔ سورۃ الاحزاب۔۲۱

۷۶۔ سورۃ النسا۔۸۳

۷۷۔ سورۃ البقرہ۔۱۷۰

۷۸۔ سورۃ ال عمران۔۳۱

۷۹۔ سورۃ الانعام۔۹۰

۸۰۔ سورۃ الطور۔۲۱

۸۱۔ سورۃ لقمان۔۱۵

۸۲۔ سورۃ النسا۔۱۱۵

۸۳۔ سورۃ ال عمران۔۹۷

۸۴۔ ایضاً۔۱۳۰

۸۵۔ سنن ابوداؤد، جلد دوم، صفحہ۲۷۹، ودیگر کتب حدیث

۸۶۔ سورۃ ترمذی بحوالہ جمع الفوائد جلد اول، صفحہ۳۰، حدیث نمبر۱۵۵

۸۷۔ صحیح بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۰۰۲، صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ۲۷

۸۸۔ صحیح مسلم، ایضاً

۸۹۔ سورۃ البقرہ۔۱۳

۹۰۔ سورۃ الفرقان۔۵۹

۹۱۔ سورۃ التحریم۔۸

۹۲۔ ایضاً۔۹

۹۳۔ تالیف قلب و مؤلفۃ القلوب سید الطاف حسین گیلانی۔ پروگریسو بکس اردو بازار۔ لاہور، طبع ۱۹۸۹ء، صفحات ۴۲۔۴۴، ۶۳، ۶۴، اسد الغابۃ تحت صخر ابن حرب

۹۴۔ سورۃ آل عمران۔۱۱۹

۹۵۔ ایضاً۔۷

۹۶۔ سورۃ یونس۔۹۴

۹۷۔ بائیبل: سموئیل اول باب ۱۶ آیت ۱۴

۹۸۔ بائیبل: کتاب پیدائش۔ ابواب ۹، ۱۹، ۲۵، ۲۷، ۳۴، ۳۵، سیموئیل دوم باب ۱۱ وغیرہ

۹۹۔ ایضاً: عہد نامہ جدید انجیل متی باب ۲۷

۱۰۰۔ بائیبل سے قرآن تک اردو ترجمہ اظہار الحق، مکتبہ دار العلوم کراچی طبع سوم جولائی ۱۹۸۶ء، جلد سوم، صفحات ۳۹۱، ۳۹۹، ۴۰۴، ۴۰۷

۱۰۱۔ سورۃ التحریم ۸

۱۰۲۔ ایضاً: الحشر ۸

۱۰۳۔ بخاری و ترمذی بحوالہ تسیر ابن کثیرؒ، سورۃ منافقو

۱۰۴۔ سورۃ الحشر ۹

۱۰۵۔ سورۃ التوبہ ۷۳۔ سورۃ التحریم ۹

۱۰۶۔ تفسیر صافی آیت مذکور۔ محسن کاشی شیعی بحوالہ تحفۂ اہل سنت علامہ عبدالشکور لکھنوی مکتبہ امدادیہ ملتان، صفحہ ۵۰۴

۱۰۷۔ سورۃ بقرہ دوسرا رکوع، سورۃ احزاب، سورۃ توب، سورہ منافقون، سوۃ مائدہ کے متعلقہ حصے

۱۰۸۔ سورۃ الفرقان ۷۴

۱۰۹/۱۔ تفسیر قمی علی بن ابراہیم شیعی شاگرد امام حسن عسکری بحوالہ تحفہ اہل سنت صفحہ ۴۷۹

۱۰۹/۲

۱۱۰۔ بخاری۔ ترمذی بحوالہ جمع الفوائد جلد دوم، صفحہ ۳۸۰، حدیث نمبر ۸۸۱۶، ۸۸۱۸، مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیۃ سمندری، لائل پور (فیصل آباد)

۱۱۱۔ تاریخ طبری، جلد ۵، صفحہ ۲۸

۱۱۲۔ البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر تحقیق احمد عبدالوھاب فقیح دار الحدیث، قاھرہ (مصر) طبع اول ۱۹۹۲ء ۷/۲۳۶، ۲۵۵، ۲۵۴/۷

۱۱۲/۱۔ ایضاً۔

۱۱۳۔ ایضاً ۳۲۲/۷

۱۱۴۔ ایضاً ۳۱/۷، تاریخ عرب جسٹس امیر علی۔ تاریخ الاسلام للذھبی ۲/۱۱

۱۱۵۔ نھج البلاغۃ۔ ۲/۱۱۸۔ طبع مصر

۱۱۶۔ سورۃ الانبیاء ۷۹

۱۱۷۔ سورۃ الاعراف ۱۵۱

۱۱۸۔ سورۃ الفتح ۲۹

۱۱۹۔ بائبل کتاب استثنا باب ۳۳ کی ابتدائی

۱۲۰۔ آیات ۲۴۔ ایضاً۔ کتاب پیدائش باب ۲۱

آیت ۲۰

۱۲۱۔ ابوداؤد و ترمذی بحوالہ جمع الفوائد، ۱/۵۴۳، حدیث نمبر ۵۹۴۹

۱۲۲۔ مسلم و ابوداود بحوالہ جمع الفوائد ۱/۴۹۲، حدیث نمبر ۵۳۴۶

۱۲۳۔ جمع الفوائد حدیث ۸۵۲۶، جلد دوم صفحہ ۳۵۱

۱۲۴۔ سورۃ الانفال، ۲۵

۱۲۵۔ مجمع الزوائد، ہیثمی ۹/۳۵۷، کنز العمال ۶/۸۷ سیر اعلام النبلاء للذھبی ۳/۹۵

۱۲۶۔ السنن سعید بن منصور ۳/۳۷۴ حدیث ۲۹۶۸ طبع مجلس علمی۔ کراچی

۱۲۷۔ سورۃ المائدہ۔ ۸

۱۲۸۔ صحیح بخاری ۲/۲۱۵، مسلم ۱/۴۲۹

۱۲۹۔ بخاری ۲/۷۲۸، مسلم ۱/۳۴۰

۱۳۰۔ بخاری ۲/۶۲۱، مسلم ۱/۳۳۹

۱۳۱۔ البدایۃ والنھایۃ ۸/۱۲۵

۱۳۲۔ ایضاً ۷/۳۲۲

۱۳۳۔ اسلامی مذاہب ابوزہرہ مصری اردو ترجمہ غلام احمد خریری، ملک سنز۔ کارخانہ بازار فیصل آباد محصلہ مضمون خوارج

۱۳۴۔ عبقات علامہ خالد محمود دارالمعارف اردو بازار۔ لاہور

۱۳۵۔ اسلامی مذاہب فرقہ زیدیہ کے افکار و معتقدات ص ۶۱

۱۳۶۔ سورۃ محمد ۱۹

۱۳۷۔ سورۃ الاحزاب ۴۳۔ سورۃ غافر ۷

۱۳۸۔ سورۃ الاعراف ۴۳۔ سورۃ الحجر ۴۱

۱۳۹۔ سورۃ الحجرات۔ ۹، ۱۰

۱۴۰۔ سورۃ التوبۃ ۷۳۔ سورۃ التحریم ۹

۱۴۱۔ سورۃ الانعام۔ ۱۰۸

۱۴۲۔ سورۃ الرعد۔ ۳۳

۱۴۳۔ سورۃ البقرہ۔ ۱۵۹

۱۴۴۔ صحیحین عن عروۃ عن عائشہؓ بحوالہ رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ طبع اول دارالاشاعت، کراچی۔ ۲/۲۷۱۔

۱۴۵۔ سورۃ الحدید۔ ۱۰